جون

2020ء

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" "اور" "اردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

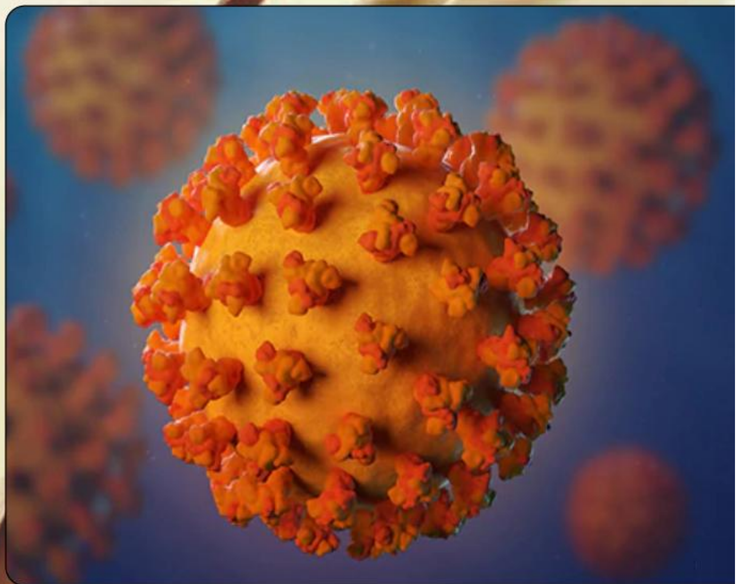

دنیا بھر میں کرونا وائرس کے نقصانات اور فوائد (ایک تجزیہ)

صفحہ 5

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی ومذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

ZINGMAAR

EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD

FOLLOW @ZINGMAAR

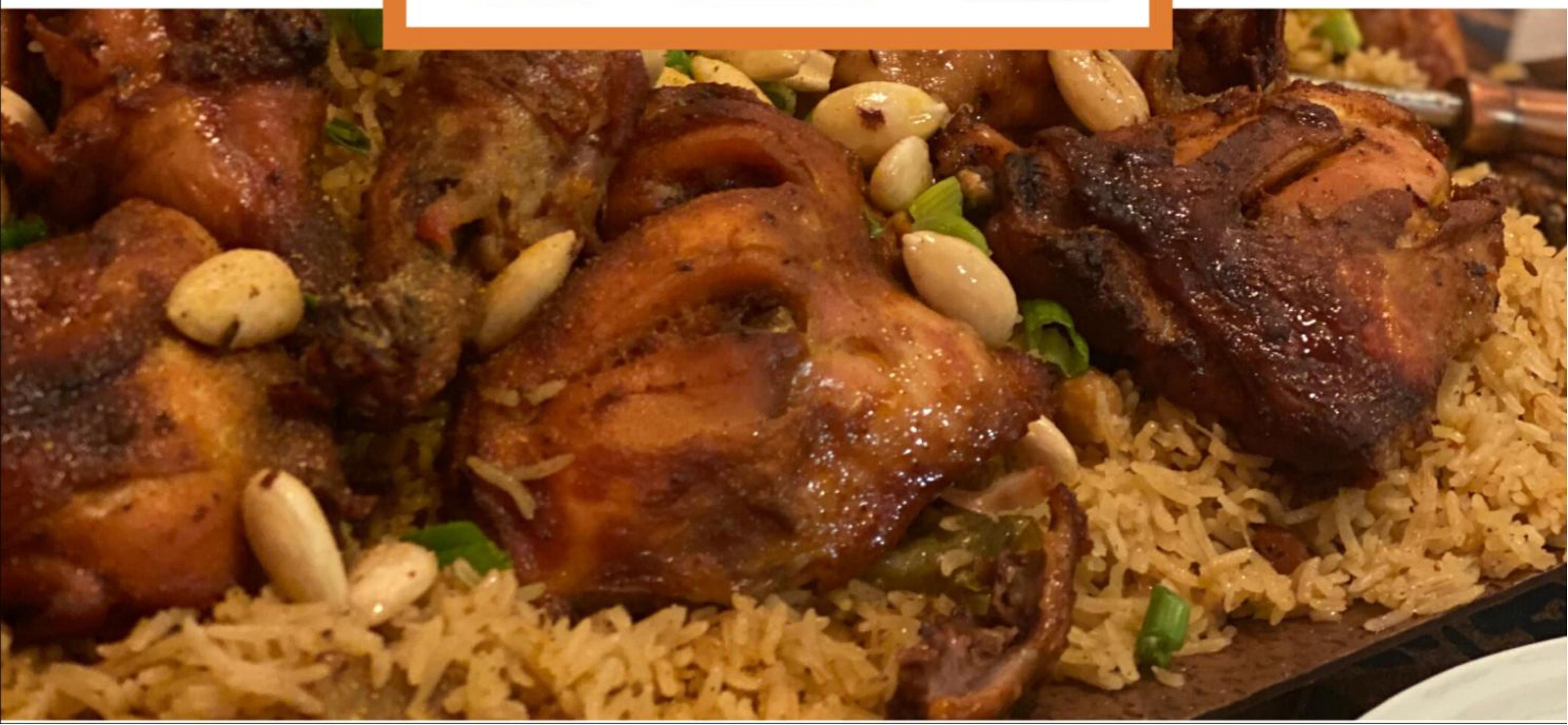

اس شمارہ میں

04 درسِ قرآن کریم
05 دنیا بھر میں کرونا وائرس کے نقصانات اور فوائد (ایک تجزیہ)
07 جسٹس نسیم حسن شاہ کے بعد مولوی مشتاق کی گواہی
09 آئیں عزم کریں
10 ریاست مدینہ اور جمہوریت کا مقدمہ
12 پڑھتا جا شرماتا جا
15 بونوں کا دیس
17 قادیانی نہ اقلیت ہیں نہ اکثریت
19 علامہ اقبالؒ اور وادیٔ جنت نظیر کشمیر
21 پاکستانی ڈراموں میں غیر حقیقی امور پر مبنی کہانیاں
23 بھارت کو کس بات کا خوف ہے؟
25 اصل کی طرف گامزن: مکلی
27 اوریا مقبول جان نے آخر سچ اُگل دیا
30 9 سو سال قدیم 'التت کا شاہی قلعہ'
32 بجواب صابر شاکر صاحب
34 1857 کی 'جنگِ آزادی': جب دلی نے موت کو رقصاں دیکھا
38 جے پور کے راجہ مادھو سنگھ راجہ داہر کیسے بن گئے؟
40 آئن سٹائن کی سب سے بڑی غلطی؟
42 17 مئی۔ ناروے کا قومی دن (یومِ آئین)
44 کیا ہمیں اپنا نواں سیارہ واپس مل جائے گا؟
46 پیٹر رائٹ اور برٹش سیکرٹ سروس
48 کیا مستقبل میں بوسہ لینا، مصافحہ کرنا یا بغل گیر ہونا معیوب سمجھا جائے گا؟
51 چند لوگ سائنس کو سنجیدگی سے لیتے ہیں
53 فضا میں وحشت سنگ وسناں کے ہوتے ہوئے
53 کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ کچھ نہ کہو خاموش رہو
54 میں چار جماعتاں کہہ پڑھیاں
55 بند کلیوں میں افسانے مت ڈھونڈو
58 ماتمی جلسہ۔۔ منٹو کی ایک کہانی جو پرانی نہیں ہوگی

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ
هُوَ الـــــــــــــنَّاصر

بعد از خُدا بعشقِ محمدؐ مخمرم گر کُفر ایں بود بخُدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 3 شمارہ نمبر 1 جمادی الاوّل 1441 جنوری 2020ء

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
+47-91698367

عرفان احمد خان (جرمنی)
+49-1711974701

ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
+49-15212005548

محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
+41-6433112

ابن الامین (برطانیہ)
+44-7940077825

بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
+92-3327051887

چوہدری مقبول احمد (بھارت)
+91-9988489365

قیمت فی شمارہ: 2 پاؤنڈ

website : lahoreinternational.com
اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:
lahoreintlondon@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

ADVERTISEMENT TARIFF
(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

درس قرآن کریم

وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ۔ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَرَحۡمَۃٌ ۟ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ۔ (سورۃالبقرۃ: 156 تا 158)

ترجمہ: اور ہم ضرور تمہیں کچھ خوف اور کچھ بھوک اور کچھ اموال اور جانوں اور پھلوں کے نقصان کے ذریعہ آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دے۔ ان لوگوں کو جن پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم یقیناً اللہ ہی کے ہیں اور ہم یقیناً اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے برکتیں ہیں اور رحمت ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت پانے والے ہیں۔ (ترجمہ از حضرت مرزا طاہر احمد)

تشریح: وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ : اس کے معنے ہیں ضرور ضرور ہمیں اپنی ذات کی قسم ہے کہ ہم تمہیں انعام دینا چاہتے ہیں مگر کچھ تھوڑا خوف دے کر۔

الۡخَوۡفِ: صوفی کہتے ہیں الٰہی خوف۔ فقہاء کے نزدیک یہ معنے ہیں کہ اکل حرام سے خوف اور شافعی کہتے ہیں جہاد کی تکلیف کا خوف۔

الۡجُوۡعِ: اس کی بھی تین صورتیں ہیں۔ (۱) روزہ۔ (۲) مال حرام ملتا ہے تو نہ لے اور اگر اس نہ لینے سے فاقہ آتا ہو تو اس فاقہ کو مقدم کر کے اسے برداشت کرے۔ (۳) بعض وقت اپنے پیٹ کو خالی رکھ کر دینی امور میں امداد دے۔

نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ: مالوں کی کمی کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ (۱) اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ (۲) رشوت، حرامزدگی، باطل سے مال ملتا ہے اسے نہ لیا۔ غرض نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ ہوتا ہے زکوٰۃ دینے سے، حرام سے بچنے سے یا کسی الٰہی حکمت کے ماتحت کسی چیز کے قبضہ سے نکل جانے سے۔

وَالۡاَنۡفُسِ: جانوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا۔ الثَّمَرٰتِ: پھلوں کی زکوٰۃ۔ اور اسے مراد اولاد بھی ہے۔

اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ: یعنی اگر خدا باوجود اس کا مالک، اس کا بادشاہ اور اس کا خالق ورب ہونے کے کوئی چیز لے لیتا ہے تو غم کی بات نہیں کیونکہ ہم نے بھی اسی کے حضور جانا ہے اور وہاں جا کر اس کا نعم البدل پانا ہے بلکہ اسی دنیا میں بھی۔ میرے نو لڑکے لڑکیاں (عبداللہ، اسامہ، حفیظ الرحمن، عبدالقیوم، امۃ اللہ، رابعہ، عائشہ، امامہ) مر چکے ہیں ہر ایک کے مرنے پر میں نے یہی خیال کیا ہے کہ آخر ایک دن ہم نے جدا ہونا تھا یا میں نے مرنا تھا یا ان میں سے کسی نے۔ بہرحال خدا کے پاس ہمیں مر کر پھر جمع ہونا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اور بہت اولاد دے دی۔ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ

اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ: صَلٰوۃ کہتے ہیں کہ بدی کا اثر اور سزا جس بات پر مرتب نہ ہو۔ ان خاصہ عنایات کا نام صَلٰوۃ ہوتا ہے۔

رَحۡمَۃٌ: یعنی علاوہ ان خاص عنایتوں کے عام رحمتوں سے بھی حصہ ملتا ہے۔ (یہ تو ایک دعویٰ تھا اب اس کا ثبوت اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔)

الثَّمَرٰتِ: جنگ میں بیٹے بھی مرتے ہیں اور کھیتی کی نگرانی نہیں ہو سکتی۔

مصائب شدائد پر صبر کرنے والوں کو اجر ملتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا کہ ہر مصیبت پر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ پڑھ کر یہ دعا مانگو اللھم اجرنی فی مصیبتی واخلفنی خیرًا منھا۔ اور قرآن شریف میں مشکلات اور مصائب پر صبر کرنے والوں کے واسطے تین طرح کے اجر کا وعدہ ہے۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ۔ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَرَحۡمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ یعنی مصائب پر صبر کرنے والوں اور اِنَّا لِلّٰہِ کہنے والوں کو تین طرح کے انعامات ملتے ہیں۔

۱۔ صلوات ہوتے ہیں ان پر اللہ کے۔ ۲۔ رحمت ہوتی ہے ان پر اللہ کی۔ ۳۔ اور آخر کار ہدایت یافتہ ہو کر ان کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا ہے۔

اب غور کرو جن مصائب کے وقت صبر کرنے والے انسان کو ان انعامات کا تصور آ جاوے جو اس کو اللہ کی طرف سے عطا ہونے کا وعدہ ہے تو بھلا پھر وہ مصیبت، مصیبت رہ سکتی ہے اور غم رہتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس کیسا پاک کلمہ ہے الحمد للہ اور کیسی پاک تعلیم ہے وہ جو مسلمانوں کو سکھائی گئی ہے۔ یہ نہایت ہی لطیف نکتہ معرفت ہے اور دل کو موہ لینے والی بات۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف اسی آیت سے شروع ہوا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام خطبات کا ابتدا بھی اسی سے ہوا۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم خوف، جوع، نقصان مال وجان و پھل کے ذریعے تمہارے اندرونی صفات کو ظاہر کریں گے اور صابروں کو بشارت دے جن کا یہ حال ہے کہ جب انہیں مصیبت پہنچے تو وہ حال وقال سے کہتے ہیں ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

صبر کی مختصر حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر ایک نیکی اور نیک بات پر جما رہے۔ بدی سے رکا رہے گویا صبر تمام نیکیوں کا جامع ہے۔ مشکل کے وقت بدی سے بچنا یہی تو صبر ہے۔ شہوت میں عفت، غضب کے وقت حلم، حرص کے مقابل میں قناعت، وقار، استقلال، ہمت، عزم پر کار فرما رہنا۔ شرع وعقل سلیم کی مخالفت نہ کرنی۔ یہ سب صبر ہے۔

{حقائق الفرقان جلد اوّل صفحہ 270 تا 274}

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

اداریہ

دنیا بھر میں کرونا وائرس کے نقصانات اور فوائد

(ایک تجزیہ)

دنیا بھر میں کرونا وائرس کا پھیلاؤ جاری ہے اور اب تک مصدقہ متاثرین کی تعداد 50 لاکھ سے زائد اور اموات کی تعداد 3 لاکھ 30 ہزار سے زائد ہو چکی ہے۔ دنیا میں تین صدیوں سے جو مختلف اقسام کے وائرس وقوع پذیر ہوئے ہیں ان میں یہ واحد وائرس ہے جس نے تمام دنیا کو بے بس اور لاچار کر دیا ہے۔ آج 4 ماہ کا عرصہ ہو گیا دنیا کے بڑے بڑے ماہر طبعیات، سائنسدان اور عظیم طاقتیں اس کی روک تھام اور بچاؤ سے ہمت ہار چکی ہیں۔ اور بے بس دکھائی دیتی ہیں۔ یاد رہے امریکہ میں اکتوبر 1929ء میں ایک بڑے معاشی بحران نے جنم لیا تھا اس کو تاریخ میں کسادی بازاری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس بحران نے مال دار اور غریب ممالک کو یکساں طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ صنعتیں بند ہو چکی تھیں سرمایہ کاروں کی ساری جمع شدہ پونجی ڈوب گئی اور اقتصادی ترقی و خوشحالی قصہ پارینہ بن گئی تھی۔ پوری دنیا میں بے روزگاری کی شرح میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور کروڑوں افراد بے روزگار ہوئے عالمی تجارت کا مجموعی حجم 50 فیصد سے بھی زیادہ تنزل کا شکار ہو گیا۔ اس بحران کی شدت اتنی تھی کہ 1932ء تک امریکہ میں موجود ہر قابل ذکر بینک بند ہو چکا تھا۔

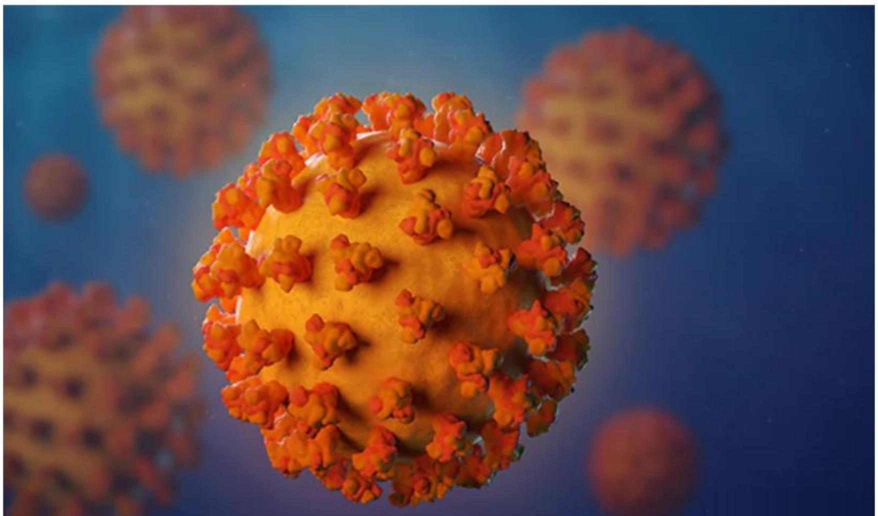

آج کرونا وائرس کی صورتحال یہ ہے کہ یہ جنوری 2020ء میں دنیا میں پھیلنا شروع ہوا۔ ابتداء میں عوام کا رویہ سطحی اور غیر سنجیدہ تھا لیکن جوں جوں وائرس پھیلنا شروع ہوا تو مختلف ملکوں نے اس کے لئے سخت حفاظتی اقدامات کئے۔ ساری دنیا میں طویل لاک ڈاؤن کی بنا ہزاروں لاکھوں کمپنیاں بند ہوچکی ہیں۔ اور کروڑوں افراد اپنی ملازمتوں سے عارضی یا مستقل طور پر فارغ ہو چکے ہیں۔ عالمی ادارہ (IMF) کے مطابق اس سال عالمی معیشت کو 3 فیصد خسارے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس اعتبار سے یہ تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دے گا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک اقتصادی مشکلات اور زبوں حالی کے اعتبار سے آنے والا وقت کساد عظیم کی بھیانک یادوں کو تازہ کر سکتا ہے۔ کرونا کے لاک ڈاؤن کی وجہ سے دنیا کے چھوٹے بڑے شہر قرنطینہ میں چلے گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہوا بازی، سیاحت، تاریخی مقامات، ریستوران ہوٹل، کلبز سب بند پڑے ہیں ان کی صنعت بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔

بعض ماہرین کا خیال ہے یورپ اور دیگر ممالک میں یہ وباء نومبر دسمبر تک ختم ہو جائے گی۔ یاد رہے ماضی میں طاعون اور اسپینش فلو بھی مئی جون میں ختم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس لئے بعض ماہرین یہ قیاس کرتے ہیں۔ یورپ میں طاعون اور اسپینش فلو پھیلا تو اس نے ایشیاء اور افریقہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ لیکن کرونا وائرس نے تو ساری دنیا کے 129 ممالک کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ اس کے نقصانات کا تجزیہ کرتے ہوئے عالمی خیراتی ادارے آکسفیم نے خبردار کیا ہے کہ کرونا وائرس سے پیدا ہونے والے معاشی اثرات عالمی غربت میں تقریباً نصف ارب تک کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی اور کنگز کالج لندن کی تحقیق کے مطابق یہ 30 سال میں پہلی مرتبہ ہوگا۔ جب عالمی سطح پر غربت میں اضافہ ہوگا۔ مزید یہ کہ اگر وائرس سے پیدا ہونے والے حالات کے سبب معاشی طبی بحران سے کہیں زیادہ ہو گا۔ اور عالمی سطح پر غربت میں بڑا اضافہ ہوگا۔

کرونا وائرس سے پاکستان میں ایک کروڑ 12 لاکھ افراد بیروزگار ہونے کا خدشہ ہے۔ 2 ہفتہ قبل ایشیاء ڈویلپمنٹ بینک کی رپورٹ کے مطابق کرونا سے صوبہ پنجاب کو 23 کھرب روپے کا نقصان ہوگا۔ بہرحال ان چار ماہ میں دنیا کی معیشت بری طرح متاثر ہوچکی ہے اور ابھی آگے کا کچھ علم نہیں کہ یہ سلسلہ رُکتا ہے یا مزید چلے گا۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عذاب الٰہی اور قدرتی آفات کی ایک لمبی تاریخ ہے جو مختلف قسم کے وائرس سے انسانی جانوں کو ضیاع کرچکی ہے۔ قیاس ہے کہ اس کے بعد کئی جنیاتی وائرس کے پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ یہ تو قدرت کا اصول ہے کبھی خوشی کبھی غم یعنی زندگی میں اُتار چڑھاؤ نفع ونقصان ہر جگہ نظر آتے ہیں اور مثبت اور منفی پہلو ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ قدرت کے اس اصول کو وائرس کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں اس کے کئی مثبت پہلو فوائد بھی نظر آئیں گے۔ اس وائرس نے بنی نوع انسان کو ایک دوسرے سے پیار کرنا اور اپنے رب کے آگے جھکنا اور دعائیں کرنا سکھا دیا ہے۔

کئی ممالک میں تو اس کے لئے اجتماعی دعائیں بھی کروادی گئی ہیں۔ ماہرین معاشیات کے مطابق عالمی منڈی میں خام تیل کی قیمتوں میں کمی کے بعد تیل درآمد کرنے والے ملکوں کی معیشت کو فائدہ ہوسکتا ہے وہ تیل درآمد کرکے اربوں ڈالر بچا سکتے ہیں۔

دنیا میں فضائی آلودگی میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے۔ موسمیاتی تبدیلی پر نظر رکھنے والے ادارے نے بتایا ہے کہ فضائی آلودگی سے آلودہ شہروں کا ائر کوالٹی انڈکس بہت بہتر ہوا ہے۔ مختلف شعبوں سے وابستہ افراد ان دنوں گھروں میں بیٹھ کر کام کررہے ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس سے انہیں سیکھنے کے مواقع مل رہے ہیں اور ٹیلی ورکنگ کے نت نئے طریقوں سے آشنا ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف ممالک میں سیر وتفریح کے مقامات پر عوام کا رش نہ ہونے کی وجہ سے وہاں صفائی اور گلیاں شاہرائیں بھی صاف نظر آرہی ہیں۔ دنیا میں فضائی آلودگی میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ جس پر قابو پانے کے لئے عالمی ادارہ نے کئی پروگرام مرتب کئے اور کئی تدابیر اختیار کریں۔ جس میں گاڑیوں کو مکمل طور پر بجلی یا بیٹری سے چلانے کے منصوبے ہیں۔ علاوہ لاک ڈاؤن کی وجہ سے فضائی آلودگی میں بہت کمی واقع ہوئی ہے۔ ساری دنیا میں رہنے والے لوگوں کو آسمان پر چاند تارے واضح نظر آنے لگے ہیں۔

لندن شہر میں ہم کو عید کا چاند صاف واضح دیکھنے کو ملا۔ اب آسمان پر طیاروں کا شور اور دھواں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کے ساتھ ہی فضائی اور سمندری جانوروں نے سکھ کا سانس لیا ہے چرندو پرند کی اقسام اور سمندری ودیگر مخلوقات کی خوشیاں دوبالا ہوگی ہوں گی جس طرح آسمان اب صاف دکھائی دیتا ہے اسی طرح سمندر، دریا، جھیلیں صاف نظر آتی ہیں۔ علاوہ ازیں دنیا میں لاک ڈاؤن کے باعث اسٹریٹ کرائم، پولیس مقدمات، ڈکیتی، اغوا، ٹارگٹ کلینگ، دھینگا مشتی، ٹریفک حادثات گھریلوں تشدد غرضیکہ کئی قسم کی برائیوں میں کمی آئی ہے اور کئی قسم کی طبی بیماریوں کے باعث اموات میں کمی واقع ہوئی ہے۔ مزید برآں جن ممالک کے آپس کے تعلقات جھگڑے اور جنگی جنون اسلحہ کا استعمال ناجائز طور پر استعمال ہو رہا ہے حکومت اور عوام نے اطمینان وسکھ کا سانس لیا ہے۔

بہرصورت ہر دو پہلو مثبت اور منفی دونوں اُجاگر کردیئے ہیں ان دونوں کے پیش نظر ہمیں بہتر مستقبل اور بہتری کے لئے اقدامات اُٹھانے چاہئے اور اپنے رب کی رضا پر راضی رہنا چاہئے۔ یہ اُسی کا کام ہے اور وہی بہتر جانتا ہے دنیا اور اس کی مخلوق کو کس طرح چلانا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ آسمانی آفت ہے اور اپنے وقت پر ہی ختم ہوگی۔ اس میں اپنی بداعمالیاں یا گناہ تلاش نہ کریں آفتیں آتی رہتی ہیں اور اپنے وقت گزار کر چلی جاتی ہیں ہمیں ثابت قدم رہنا ہے۔ اور آئندہ کے لئے سوچنا ہے۔ بس تمام سے ایک التجاء ہے کہ آج دنیا پہ جو قہر طاری ہے ابھی بھی وقت ہے لوگو! خدا سے گڑگڑا کر معافی اور توبہ کرو وہ جلدی مان جاتا ہے اور بہت معاف کرنے والا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے لوگو! اپنے حقیقی وحدہ لاشریک کو راضی کرلو۔ گزرا وقت واپس نہیں آتا وہ اپنے بندہ کی فریاد کو سنتا ہے اور بار بار معاف کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے احکامات اور رسول کریم ﷺ کی تعلیمات اور نیک بزرگوں، ولیوں اور اپنے امام کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تحریر: اشرف شریف

شعبہ پاکستان

جسٹس نسیم حسن شاہ کے بعد مولوی مشتاق کی گواہی

لاہور ماڈل ٹاؤن موڑ کی طرف سے داخل ہوں تو بائیں ہاتھ آموں کے قدیم درخت ہیں۔ کسی زمانے میں شروع والے حصے میں نرسری تھی۔ نرسری کے آگے فیروز پور روڈ کے ساتھ ساتھ آموں کا باغ آتا۔ باغ سے ایچ بلاک تک کھیت ہم نے اپنے بچپن میں دیکھے۔ یہ کھیت نواز شریف کے گھر کے سامنے واقع کچی بستی کی دیوار کو چھو کر ختم ہو جاتے۔ اسی ایچ بلاک کی کہانی لکھتے ہوئے مظفر بخاری صاحب نے ایک ایسا انکشاف کر دیا کہ بھٹو کے حامی اور مخالف سوشل میڈیا پر پھر آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ بس کسی کو معاملے سے دلچسپی دکھائی نہیں دی تو وہ بھٹو صاحب کی جماعت پیپلز پارٹی اور ان کا نواسہ بلاول۔ ماڈل ٹاؤن بی بلاک سے ایک چھوٹی سڑک اس آموں والے باغ کے سامنے جا نکلتی ہے۔ جیسے ہی باہر آئیں دائیں ہاتھ نامور ڈرامہ نگار اور ادیب امتیاز علی تاج کا مکان ہے۔ بھٹو صاحب کو سزائے موت دینے والے جسٹس مولوی محمد مشتاق کا گھر اس چھوٹی سڑک پر اب بھی بُرے حال میں ہے۔ مولوی مشتاق جب فوت ہوئے تو ان کی میت نماز جنازہ کے لیے ان ہی آموں کے قریب رکھی گئی۔ یہاں سنبل کے کچھ پیڑ ہیں۔ شہد کی مکھیوں نے وہاں سات آٹھ فٹ کے کئی چھتے بنا رکھے تھے۔ کئی دن سے ادھر جا نہیں سکا، شاید اب بھی ہوں۔ کہتے ہیں پیپلز پارٹی کے کسی جیالے نے ان چھتوں پر پتھر پھینک دیئے۔ مکھیاں آناً فاناً جنازے کے لیے جمع لوگوں پر حملہ آور ہو گئیں۔ بہت سے لوگ بری طرح کاٹے جانے سے ہسپتال پہنچے۔ بھٹو صاحب کے جیالے کہتے ہیں کہ مکھیاں خدا کی طرف سے سزا دینے کو بھیجی گئیں۔ کئی سال پہلے کسی ڈائجسٹ کا ایک پرانا شمارہ دیکھا۔ اس میں مولوی مشتاق کی میت چارپائی پر اکیلی پڑی تھی اور لوگ دور بھاگ چکے تھے، یہ تصویر ریکارڈ کا حصہ ہے۔ مظفر بخاری صاحب لگ بھگ پینتالیس سال سے مختلف اخبارات کے لیے لکھ رہے ہیں۔ ”روزنامہ دن“ میں ان سے تعارف ہوا۔ شفقت کرتے ہیں۔ ان دنوں ہمارے اخبار میں لکھ رہے ہیں۔ نواز شریف کے ماڈل ٹاؤن والے گھر کے تقریباً سامنے ان کی رہائش ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں ہمارا سکول تھا۔ پہلے رہائش بھی ساتھ والے گارڈن ٹاؤن میں رہی۔ بخاری صاحب کو فون کر کے پوچھا کہ مولوی مشتاق نے آپ سے ہی کیوں کہا کہ بھٹو صاحب کو پھانسی غلط دی گئی۔ بخاری صاحب نے بتایا کہ ان کے ایک عزیز صادق علی شاہ تھے۔ شاہ صاحب اور مولوی مشتاق اوائل جوانی سے دوست تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صادق شاہ لاہور ہائیکورٹ کے بیلف ہونے کے باوجود جج بننے والے مولوی مشتاق سے بے تکلف تھے۔ مولوی مشتاق بھی ان سے بے تکلفی سے معاملات کرتے۔ صادق علی شاہ کے فرزند جاوید نے بی اے کے بعد ایل ایل بی کیا۔ مولوی مشتاق نے جاوید کو بھی بیلف بھرتی کرا دیا بلکہ اس کے لیے سرکاری رہائش کا انتظام بھی کرا دیا۔ بخاری صاحب کے بقول انہوں نے مولوی مشتاق کے گھر گارڈ کے فرائض انجام دینے والے صاحب سے کہا کہ وہ جج صاحب سے

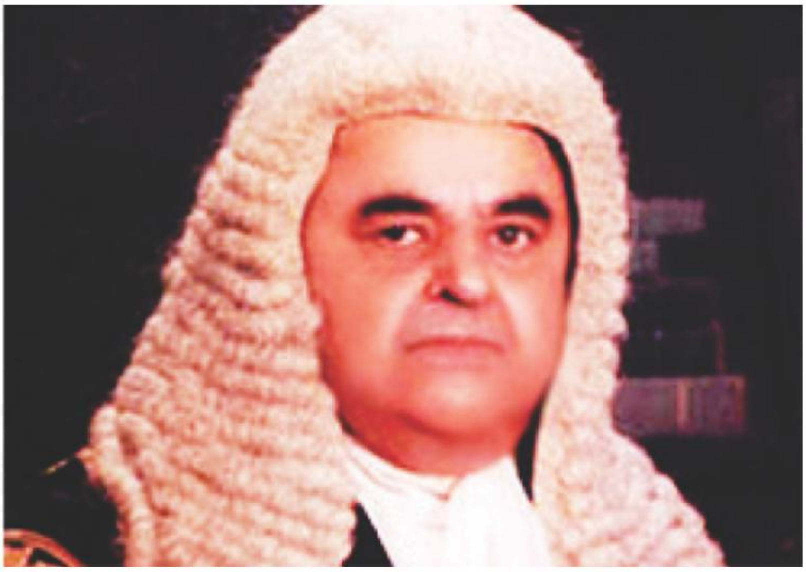

ملنا چاہتے ہیں۔ اپنے تعارف میں انہوں نے بتایا کہ وہ صادق علی شاہ کے کزن ہیں۔ مولوی مشتاق ان دنوں لاغر ہو چکے تھے۔ بہت کم لوگ ان سے ملنے آیا کرتے۔ ماڈل ٹاؤن کے ہر بلاک کے درمیان میں دائرے کی شکل میں کمرشل ایریا ہے۔ بی بلاک کی مارکیٹ ان سے دس بارہ گھر کے فاصلے پر تھی۔ جو لوگ ماڈل ٹاؤن کے مزاج کو جانتے ہیں انہیں علم ہے کہ دکاندار ہر گھر کے افراد سے واقف ہوتے ہیں۔ ڈیفنس کے اجنبی ماحول میں اسی لیے ماڈل ٹاؤن والے ایڈجسٹ نہیں ہو پاتے۔ بہرحال پہلی ملاقات کے بعد مظفر بخاری صاحب مولوی مشتاق سے ملتے رہے۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران مولوی مشتاق نے انکشاف کیا کہ ان پر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس انوارالحق کا سخت دباؤ تھا اور وہ خود بھی بھٹو صاحب سے کسی وجہ سے خفا تھے۔ اس لیے انہوں نے ان کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے ناانصافی کی۔ بخاری صاحب کا کہنا ہے کہ مولوی مشتاق اس بات پر بہت پشیمان اور افسردہ رہتے۔ انہوں نے کئی دکانداروں اور ہمسایوں کے ساتھ بھی اسی طرح کی گفتگو کی۔ بھٹو صاحب کی ایک کتاب ہے ''اگر مجھے قتل کر دیا گیا''۔ بھٹو صاحب کے دوست، بے نظیر بھٹو کے فارن سپوکس پرسن اور بلاول بھٹو کے سینئر ایڈوائزر جناب بشیر ریاض نے یہ کتاب چند برس قبل تحفہ کی تھی۔ اس میں ایک باب قصوری قتل کیس سے متعلق ہے۔ اس مقدمے پر بھٹو صاحب نے خود وضاحت کی ہے۔ اب تک ہزاروں مضامین اخبارات اور جرائد میں اس حوالے سے شائع ہو چکے ہیں۔ میری جسٹس ایس کے صمدانی مرحوم سے بھی ملاقاتیں رہیں جنہوں نے بھٹو صاحب کی ضمانت لینے کے بعد ضیاءالحق کو بھگتا۔ جسٹس صمدانی کس پائے کی شخصیت تھے اس پر بات کرنے والے سینکڑوں لوگ ابھی حیات ہیں۔ بے نظیر بھٹو کی سوانح ''دختر مشرق'' کے صفحہ 186 پر ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ''مارچ 1979ء کے پہلے ہفتوں میں بھٹو صاحب کے وکلاء نے عدالت میں نظر ثانی کی اپیل پر دلائل کے انبار لگا دیئے لیکن ایک دن میں اور میری والدہ نے بی بی سی شام کی سروس سننا چاہی تو ہمیں پتہ چلا کہ میرے والد کے وکلائے صفائی میں سے مسٹر غلام علی میمن فلیش مین ہوٹل میں اپنی ڈیسک پر کام کرتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے۔ وہ آخری عدالتی جرح میں دلائل لکھوا رہے تھے اور آخر وقت زبان سے ''اللہ، اللہ'' کے الفاظ ادا ہوئے۔ مارشل لاء کا ایک اور شکار پار ہو گیا۔ ہم نے ریڈیو بند کر دیا، ہم کچھ کہنے میں بے بس تھیں۔'' بھٹو صاحب کو موت کی سزا دینے والوں میں سے ایک جسٹس نسیم حسن شاہ پہلے ہی اپنے فیصلے پر شرمندگی کا اظہار کر کے دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ جسٹس مولوی مشتاق کے حوالے سے گواہیاں موجود ہیں۔ بس ریکارڈ کرنے کی ضرورت ہے۔ معلوم نہیں بلاول بھٹو نے صرف سیاست سیکھی ہے یا وراثت میں بھٹو صاحب کے دفاع کی جائیداد بھی ان کے پاس ہے۔ انہیں سیاست کرتے ہوئے چار پانچ سال ہو چکے ہیں۔ کچھ برس ہوئے بھٹو کیس دوبارہ کھولنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ معلوم نہیں بھٹو کا دفاع کرنے والا کوئی بھٹو بچا ہے یا نہیں؟

❁❁❁

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی، ...... ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ ..... اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

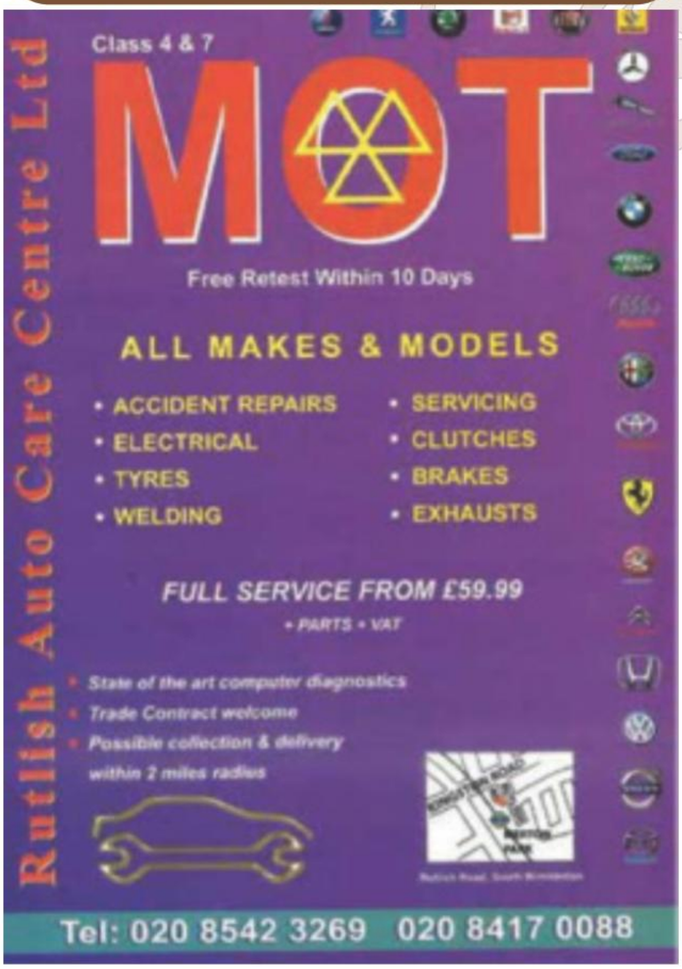

آئیں عزم کریں

تحریر: عامر اختر یوسفزئی

بدقسمتی سے ہمارے ملک کے چالیس فیصد سے زائد افراد ایسے ہیں جو کہ غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ ایسے افراد جو کہ عام حالات میں بھی بہت تکلیف اور پریشانی سے زندگی بسر کرتے ہیں، لاک ڈاؤن کی اس کٹھن صورتحال میں ان کے گھر کے چُھولے مکمل طور پر بجھے ہوئے ہیں، ہمارا دین اسلام بھی ہمیں غریبوں، بے کسوں، ناداروں اور ضرورت مندوں کی مدد، معاونت، حاجت روائی اور دلجوئی کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ دوسروں کی مدد کرنے، ان کے ساتھ تعاون کرنے، ان کے لیے روزمرہ کی ضرورت کی اشیاء فراہم کرنے کو دین اسلام نے ربّ کو راضی کرنے کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ خالق کائنات اللہ تعالیٰ ربّ العزت نے امیروں کو اپنے مال میں سے غریبوں کو دینے کا حکم دیا ہے، لاک ڈاون کی اس کٹھن صورتحال میں صاحب استطاعت لوگوں پر واجب ہے کہ وہ غریب، نادار اور مستحقین کی مدد کرے۔ جو لوگ اپنے مال سے محبت کرنے کے باوجود اسکو غریبوں، محتاجوں اور مستحق افراد کی مدد کرنے پر خرچ کرتے ہیں قرآن مجید فرقان حمید میں ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے "* نیکی صرف یہی نہیں کہ آپ لوگ اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لیں بلکہ اصل نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (آسمانی) کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے، اور مال سے محبت کے باوجود اسے قرابت داروں، یتیموں محتاجوں مسافروں، سوال کرنے والوں، اور غلاموں کی آزادی پر خرچ کرے، یہ وہ لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں اور جب کوئی وعدہ کریں تو اسے پورا کرتے ہیں۔ سختی، مصیبت اور جہاد کے وقت صبر کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں" (سورۃ البقرۃ آیت 177)۔* لاک ڈاؤن کی اس کٹھن صورتحال میں آج ہم سب کو مثالی ایثار و یکجہتی کی اشد ضرورت ہے تمام مخیر حضرات کو چاہئے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق اپنے اپنے دائروں، احاطوں اور حدود کے اندر مستحقین کی مدد کو یقینی بنا کر اپنے پڑوس، گلی محلے اور شہر بھر میں ایسا اہتمام کرنا چاہیے کہ کوئی بھی فرد کسی بھی گھر میں بھوکا نہ رہ جائے۔ اسلام کے فلسفہ سماجی بہبود کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ ہم معاشرے کے محتاجوں، بے کسوں، معذوروں، بیماروں، بیواؤں، یتیموں اور بے سہارا افراد کی دیکھ بھال کرے اور ان کی مدد کرے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب ایسے لوگوں کی ضرورت اور معذوروی کا خاتمہ کر کے معاشرے میں دولت وضرورت کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔ اور جو لوگ معاشرے سے غربت وافلاس اور ضرورت کو دور کرنے کے لئے اپنا مال ودولت خرچ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے خرچ کو اپنے ذمے قرض حسنہ قرار دیتے ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کی بھی ضمانت دیتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کئے گئے مال کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا۔ دوسروں کی مدد کرنا ان کی ضروریات زندگی کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت پسندیدہ عمل ہے، دوسروں کی خیر خواہی اور مدد کرنے سے نہ صرف حقیقی خوشی اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے بلکہ رضائے الٰہی کا سبب بھی بنتی ہے۔

محسن انسانیت نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنے کا حکم دیا بلکہ عملی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ہمیشہ غریبوں، یتیموں، مسکینوں اور ضرورتمندوں کی مدد فرماتے تھے حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ "مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے* وہ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی حاجت روائی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی فرماتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی فرمائے گا* دنیا میں اپنے لئے تو سبھی جیتے ہیں، مگر دوسروں کے لئے جینا ہی اصل زندگی ہے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ کیوں نہ ہم دوسروں کے لئے جیا جائے، دوسروں کی مشکلات و مسائل کو محسوس کرتے ہوئے ان کا ہاتھ بٹایا جائے۔ ہماری مدد و معاونت سے اگر کسی کی دلجوئی ہوسکتی ہے، ان کی پریشانی اور مشکلات آسان ہوسکتی ہے تو کیوں نہ انکی مدد کی جائے، کسی مجبور کے حصول رزق میں معاونت ہوسکتی ہے تو یہ ہمارے لئے باعث مسرت ہوگا۔

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔

ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم وتدریس وتربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

ریاست مدینہ اور جمہوریت کا مقدمہ

تحریر: سید مجاہد علی

ملک میں بدعنوانی کے خلاف مقدمہ کو جمہوریت کا گلا گھونٹنے کا ذریعہ بنالیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ سیاسی ہتھکنڈا ملک کی طاقت ور بیوروکریسی اور اسٹبلشمنٹ نے پچاس کی دہائی میں دریافت کیا تھا لیکن اسے صرف فوجی حکومتوں نے ہی نہیں بلکہ بلاتخصیص ہر سیاسی حکومت نے بھی مخالفین کی آواز دبانے کے لئے استعمال کیا۔ اس طرح احتساب جو کسی بھی جمہوری عمل کا بنیادی عنصر ہونا چاہئے، اسے اسی عمل کو پامال کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ کہنا اصولی طور پر غلط نہیں ہے کہ اس وقت جمہوریت کے حوالے سے ملک کو جن مشکلات کا سامنا ہے، انہیں پروان چڑھانے میں آمرانہ ادوار کے علاوہ سیاسی لیڈروں اور جماعتوں نے بھی کردار ادا کیا ہے۔ ایک تو بڑی سیاسی جماعتوں پر خاندانوں کی اجارہ داری اور شخصیت پرستی کی صورت حال اور پھر ملک میں جمہوریت کا دعویدار ہونے کے باوجود سیاست دانوں کی طرف سے ایک دوسرے کی حیثیت اور مقبولیت کو تسلیم نہ کرنے کے رویہ نے پاکستان میں جمہوری سفر کو مشکل تر بنا دیا ہے۔ سیاسی جماعتوں نے ملک کی مختصر تاریخ میں متعدد

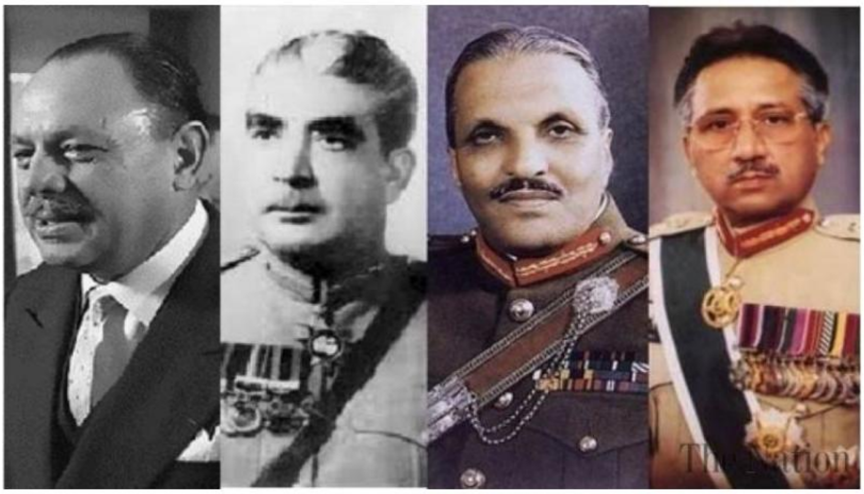

افسوسناک سانحات کا سامنا کرنے کے باوجود اس سچائی کو بھی تسلیم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ملک میں جمہوریت کی پرداخت کے لئے سیاسی جماعتوں کو بھی جمہوری طریقہ کار کے مطابق استوار کیا جائے۔ کوئی سیاسی جماعت انتخابی طریقہ اختیار کرنے اور ارکان کی رائے کے مطابق پارٹی کے مختلف عہدوں پر تقرریوں کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اس کے لئے نامزدگی اور فرد واحد کے کامل اختیار کو ہی واحد قابل عمل طریقہ سمجھ لیا گیا ہے۔

جماعت اسلامی اگرچہ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ باقاعدہ انتخابات منعقد کرواتی ہے اور اس کے عہدیداران اور امیر ارکان کی رائے کے مطابق ہی منتخب ہوتے ہیں۔ تاہم ایک تو اس جماعت کا قومی سیاست میں کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی بھی دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح ملک کے بائیس کروڑ لوگوں کی نمائیندگی کا موقع حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن اس کی اپنی لیڈر شپ کو چننے یا پارٹی ڈھانچے میں قیادت حاصل کرنے کا موقع صرف ان ارکان کی صوابدید پر ہی ہوتا ہے جنہیں جماعت کے منشور اور لائحہ عمل کے مطابق برس ہا برس کی خدمات کے بعد رفیق سے رکن بننے کا اعزاز حاصل ہوجائے۔ اس طرح جماعت اسلامی کسی ایسی سیاسی پارٹی کا ڈھانچہ سامنے لانے میں کامیاب نہیں ہوئی جہاں لوگوں کو وسیع بنیاد پر رائے ظاہر کرنے اور پارٹی کی ہئیت، مقاصد یا نقطہ نظر میں تبدیلی لانے کا حق حاصل ہوسکے۔ ایک تو جماعت کے انتخاب کا طریقہ زیادہ سے زیادہ بالواسطہ کہا جاسکتا ہے، دوسرے جن ارکان کو ووٹ دینے کے قابل سمجھا جاتا ہے، انہیں پہلے سے جماعت کے بنیادی مقاصد سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ گویا یہ لوگ جماعت اسلامی کی اصلاح کرنے کے اہل بھی نہیں ہوتے بلکہ انہیں ایک خاص ڈھانچے کا پابند اور خاص نقطہ نظر کا مبلغ بننا پڑتا ہے۔

یہ گروہ کسی بھی طرح ملک کے آئین کے تحت مروج کئے گئے جمہوری نظام میں کوئی مثبت کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ عمران خان نے شروع کے برسوں میں تحریک انصاف کو منظم سیاسی جماعت بنانے کا ارادہ ضرور ظاہر کیا تھا تاہم جب جہانگیر ترین کی قیادت میں پارٹی کے دروازے الیکٹ ایبلز کے لئے کھولنے اور ہر دور میں اقتدار میں رہنے والے سیاسی خانوادوں کا خیر مقدم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو عمران خان نے اپنے ہی مقرر کئے ہوئے پارٹی الیکشن کمیشن کو مسترد کردیا اور اس کے سربراہ جسٹس (ر) وجیہ الدین کو کنارہ کش ہونا پڑا۔ یوں بھی یہ وہ دور تھا جب عمران خان برطانیہ اور مغربی ممالک میں نافذ جمہوریت کی مثال دے کر پاکستان کو حقیقی جمہوری معاشرہ بنانے کی بات کیا کرتے تھے۔ پھر ان پر یہ ادراک ہوا کہ اقتدار تک پہنچنے کے لئے صرف سیاسی خانوادوں کو ہی قبول نہیں کرنا پڑے گا بلکہ جمہوری اصول سے بھی دست کش ہونا پڑے گا۔ لہذا عمران خان بھی مغربی پارلیمانی جمہوریت کی مثالیں دینے کی بجائے سعودی عرب میں نافذ شاہی جبر کو احتساب اور چین کے آمرانہ نظام میں سیاسی انتقام کو ملکی بہتری کا راستہ قرار دینے لگے۔ اب وہ نئے پاکستان میں

جمہوریت کی نہیں بلکہ مدینہ ریاست کی بات کرتے ہیں۔ ملک کے مذہبی رہنماؤں کو ہر دور میں برسر اقتدار طبقہ کی کاسہ لیسی کرنا ہوتی ہے، اس لئے وہ بھی اس دعویٰ کی سچائی کو چیلنج کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اور نہ ہی ملک کا کوئی سیاسی دانشور پارلیمانی نظام اور ریاست مدینہ میں بیعت کے طریقہ کا موازنہ کرتے ہوئے اسے جمہوریت کی کسوٹی پر پرکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

تحریک انصاف کی طرف سے جب آئینی اصلاحات یا ملک کے پارلیمانی نظام کے نقائص کی بات کی جاتی ہے تو اسے صرف وقتی سیاسی نعرہ سمجھ کر آگے نہیں بڑھا جاسکتا بلکہ اسے عمران خان کے مدینہ ریاست کے ماڈل کو نافذ کرنے کی خواہش کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ فی الوقت صوبوں کو ملنے والے اختیارات کے بعد کمزور مرکز کا مقدمہ پیش کرکے رائے عامہ کو اٹھارویں ترمیم میں تبدیلی اور این ایف سی ایوارڈ میں قومی وسائل کی تقسیم کے اصول کو تبدیل کرنے کے لئے ہموار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ وزیر اطلاعات شبلی فراز نے آج ہی ایک ٹی وی پروگرام میں اس بات کو دہرایا ہے کہ حکومت این ایف سی ایوارڈ میں تبدیلی چاہتی ہے۔ اس تبدیلی کے ذریعے صوبوں کو مالی وسائل میں ان کے متفقہ حصہ سے محروم کرنے کی بات کی جارہی ہے۔ اس صورت حال کو اگر تحریک انصاف کی طرف سے وسائل اور اختیارات کو مرکز میں جمع کرنے اور اسی حوالے سے شروع کی گئی صدارتی نظام کی بحث کے تناظر میں دیکھا جائے اور پھر اس خواہش کا مقابلہ عمران خان کے مدینہ ریاست کے منصوبہ سے کیا جائے تو موجودہ حکومت کا اصل سیاسی مقصد سمجھا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے تحت عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ملکی آئین کی بنیادی جمہوری خصوصیات کو ختم کرنے اور ملک میں شخصی حکومت کا راستہ ہموار کرنے کے لئے عوامی رائے کو تیار کیا جائے گا۔ مذہبی لیڈروں کو مختلف اوقات میں مراعات دے کر اس منصوبہ کی تائید کرنے اور وقت آنے پر اس کے لئے گراؤنڈ ورک کرنے کا فریضہ سونپا جائے گا۔ عمران خان بھلے یہی سمجھتے ہوں کہ اس طرح ان کا اقتدار مستحکم ہوجائے گا اور وہ تاحیات ملک کے بااختیار حاکم بن جائیں گے۔ لیکن اس منصوبہ کی روح کو سمجھنے کے لئے ملک میں سول ملٹری تعلقات کی تاریخ، جمہوریت کے راستے میں کانٹے بونے کے لئے اسٹیبلشمنٹ کے کردار اور علاقائی خودمختاری کی بجائے مضبوط مرکز اور اختیارات کے ارتکاز کی خواہش کو سمجھنا ضروری ہے۔ سمجھ لینا چاہئے کہ ملک میں نافذ موجودہ جمہوری نظام کو اسی خواہش اور کوشش کی طرف سے سب سے زیادہ خطرہ ہے۔ ملک میں جمہوریت کے لئے دراصل یہی مزاج سب سے بڑا خطرہ ہے جس کے تحت مل جل کر فیصلے کرنے کا طریقہ درست نہیں ہوتا بلکہ طاقت کا ایک محور و مرکز بے حد ضروری ہوتا ہے۔ مدینہ ریاست کے فلاحی پہلوؤں کا پرچار کرتے ہوئے ملک میں دراصل ایک ایسا سیاسی نظام لانے کی خواہش کو پروان چڑھایا جارہا ہے جس میں سارے اختیارات اسلام آباد میں جمع ہوجائیں اور مقامی سطح پر فیصلے کرنے، علاقائی وسائل پر استحقاق کا مقدمہ قائم کرنے اور طاقت ور صوبوں کے بعد مضبوط بلدیاتی نظام کے ذریعے اختیار کو عام آدمی ترک پہنچانے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس مقصد کے لئے کام کرنے والی قوتیں کب اور کیسے یہ تبدیلی لاسکیں گی لیکن ان تبدیلیوں کے دوررس نتائج مرتب ہوں گے اور اس کا اصل نشانہ ملک کا پارلیمانی نظام ہوگا۔

اس لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ این ایف سی ایوارڈ یا اٹھارویں ترمیم کے حوالے سے شروع کئے گئے مباحث ٹی وی پروگراموں یا اخباری کالموں کی بجائے پارلیمنٹ میں ہوسکیں۔ اس کے علاوہ ملک میں جمہوریت کی بحث میں عقیدہ اور مذہبی علامات کے استعمال کو مسترد کیا جائے۔ سیاسی پارٹیوں میں جمہوریت نہ لانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ یہ پارٹیاں اپنی اپنی جگہ پر ایک خاندان یا فرد واحد کی خواہشات اور ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدعنوانی کو سیاسی نعرہ بنا دیا گیا ہے حالانکہ انفرادی یا ادارہ جاتی کرپشن کا سراغ لگانا اور ملوث افراد کو سزا دلوانا متعلقہ اداروں اور عدالتوں کا کام ہونا چاہئے۔ کرپشن اور سیاست کے تال میل سے ہی منتخب لیڈروں کو عسکری قیادت کی مرضی کا محتاج بنایا جاتا ہے اور سیاست دان شہباز شریف کی طرح عوام کے ووٹ پر انحصار کرنے کی بجائے مقتدر حلقوں کے ساتھ ساز باز کو ہی اقتدار کی بساط پر کامیابی کی وجہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ملک میں جمہوریت کی کامیابی کے لئے اس تاثر کو ختم کرنا ضروری ہے کہ کوئی شخص عوام کی مرضی سے نہیں بلکہ اسٹیبلشمنٹ کی تائید سے حکومت قائم کرسکتا ہے۔ اقتدار تک پہنچنے کے اسی شیطانی چکر نے ہر دور میں جمہوریت کو زخمی کیا ہے۔ سیاسی منشور پر مباحث اور غور کی بجائے لین دین، مصالحت، طاقت ور حلقوں کے درمیان اختیار کے توازن کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جب تک سیاسی رسہ کشی کا مقصد اقتدار کا حصول ہوگا اور ملکی آئین کے تقاضوں اور عوامی خواہشات کی تکمیل کا مقصد فراموش کیا جائے گا، ملک میں جمہوریت کے سادہ مقدمہ کو نقصان پہنچتا رہے گا۔ یعنی عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے لوگ، ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے امور حکومت سرانجام دیں۔ آزادی رائے اور سیاسی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لئے کرپشن کے الزامات سمیت ہمہ قسم ہتھکنڈوں کو مسترد کیا جائے۔ نظام میں شفافیت لانا ہر حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ جو حکومت یہ کام نہ کرسکے، اس کا مقدمہ عوامی عدالت میں پیش ہونا چاہئے۔

❁❁❁

شعبہ پاکستان

پڑھتا جا شرماتا جا

تحریر: محمد آرش انور

نیب ترمیمی آرڈیننس: وقت کی ضرورت یا نیا این آر او؟ کے عنوان سے ایک بین الاقوامی بڑے نشریاتی ادارے کا شائع کردہ آرٹیکل پڑھنے کا اتفاق ہوا جو صرف اور صرف نیب کے اختیارات محدود کرنے یعنی آسان لفظوں میں نیب کے پر کاٹنے پر لکھا گیا تھا۔ اس آرٹیکل میں ہمارے پاکستانی سیاست دانوں کی سوچ اور مجبوریوں کو بیان کرکے بھگو بھگو کر۔۔۔ خیر چھوڑیں کیا مارا گیا ہے یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے؟

قومی احتساب بیورو یعنی نیب کے قیام سے قبل وفاقی ادارہ فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی (ایف آئی اے) اور صوبوں میں محکمہ اینٹی کرپشن اسٹیبلشمنٹ (ACE) کے نام سے محکمے موجود تھے۔ ایف آئی اے مرکز جبکہ محکمہ اینٹی کرپشن وزرائے اعلیٰ کے تابع ہیں، اِن محکموں کی موجودگی میں کیوں پٹواری اور تحصیلدار یا سپاہی کی سطح کے سرکاری ملازمین کے علاوہ کسی مگرمچھ یا مافیا پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا اور ملک کھربوں ڈالر کا مقروض کیونکر ہوا یہ عام فہم سی بات ہے۔ جس طرح مختلف لوگ مل کر کوئی تنظیم بناتے ہیں یا سرکاری اداروں میں سی بی اے ہوتی ہے بالکل اسی طرح اینٹی کرپشن اور ایف آئی اے کی دسترس سے باہر ان بڑے ٹائیکونز نے اپنی بقا کیلئے ریاست اور سیاست میں اپنی جڑیں مضبوط کرلیں جس کی آسان مثال 'پیسہ پھینک تماشا دیکھ' دی جاسکتی ہے۔ ایف آئی اے اور اینٹی کرپشن محکموں کے باوجود قومی احتساب بیورو (نیب) کے نام سے ادارہ قائم کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ نچلے درجے کے سرکاری ملازمین کا ہی نہیں بلکہ اعلیٰ افسران اور حکمرانوں کا بھی بلاتمیز احتساب ضروری ہے۔ وگرنہ یہ سمجھ لیا جائے کہ صرف چھوٹا سرکاری ملازم ہی کرپٹ اور بے ایمان ہے اور وطن عزیز جو کھربوں ڈالر کا مقروض ہے یہ تمام قرضے حوالدار، پٹواری، تحصیلدار اور کلرک درجہ کے سرکاری ملازمین کی پانچ دس ہزار روپے کی کرپشن کی وجہ سے ہے۔ نیب کے قیام کے بعد اربابِ اختیار، حکمرانوں اور سیاست دانوں کو اس بڑی غلطی کا فوراً احساس ہوگیا کیونکہ نیب نے ان درجات کے سرکاری افسران پر ہاتھ ڈالا جو خود کو باوردی حکمران سمجھتے تھے اس کے ساتھ ساتھ وہ سیاست دان بھی نیب کے ہتھے چڑھے جن کا خیال تھا کہ منکر نکیر بھی ان سے قبر میں حساب نہیں لے سکتے۔ اس کی واضح مثال سابق وزیراعظم میاں نواز شریف، سابق صدر مملکت آصف علی زرداری، سابق وزیراعظم شاہد خاقان عباسی، چوہدری برادران، خواجہ برادران، قومی اسمبلی میں سابق اپوزیشن لیڈر سید خورشید شاہ، بیگم فریال تالپور، احسن اقبال، سابق وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف، علیم خان، سبطین خان، حمزہ شہباز اور ہزاروں ایسی شخصیات ہیں جن کے حکم پر مالی جرائم میں ملوث افراد چھوٹتے تھے، وہ شخصیات خود کرپشن کے کیسز میں سلاخوں کے پیچھے آئے۔

نیب نے بیوروکریٹس پر ہاتھ ڈالا تو جیلوں کی رونقیں دوبالا ہوگئیں۔ لینڈ مافیاز پر ہاتھ ڈالا تو بڑے بڑے ٹائیکونز کو عوامی فلاح کے منصوبوں میں حکومت کی اعانت کرنے کا خیال آگیا اور بڑی بڑی رقوم کے چیک وقت کے حکمرانوں کو پیش کیے جانے لگے۔ ایک طرف نیب کو عوام میں پذیرائی مل رہی تھی کہ جن لوگوں کے پاک دامنی کی قسمیں سیاسی فرشتے کھاتے ہیں نیب ان کے کچے چھٹے کھول رہا تھا تو دوسری طرف سیاست کے ذریعے روزگار کمانے والے اس شتر بے مہار اور اتھرے نیب سے پریشان تھے۔ ایک طرف بین الاقوامی ادارے پاکستان میں کرپشن کم ہونے کی وجہ نیب کے کام کو قرار دے رہے تھے تو دوسری طرف نیب کا مکو ٹھپنے کیلئے ایک دوسرے کی عزتیں اچھالنے والے، کراچی سے خیبر تک سڑکوں پر گھسیٹنے والے خالہ اور چچازاد بھائیوں جیسے رشتے آپس میں قائم کررہے تھے لیکن بفضلِ تعالیٰ نیب کے اختیارات محدود کرنے کا سہرا ان موجودہ حکمرانوں کے ماتھے پر ہی بندھنے جارہا ہے جو انصاف عام، احتساب سرعام کا نعرہ لگا کر سیاست کے میدان میں کودے تھے۔ مبارکباد ان شوگر مافیا، لینڈ مافیا، گندم مافیا، لیزر سبسڈی مافیا، ادویات مافیا، آئی پی پیز مافیا کو جن کی دعائیں رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں سنی جارہی ہیں اور تعزیت کلرکوں، پٹواریوں، تھانیداروں اور چپراسیوں سے کہ اب وہ ایک بار پھر اس ملک کو کھربوں ڈالر کا مقروض کرنے کے ذمے دار ٹھہر جائیں گے۔ ماضی میں 2008 تک پاکستان پہ اندرونی قرضہ کا حجم 6 ٹریلین (کھرب) ڈالر پر محیط تھا، صرف 5 سال کیا گزرے یہی قرض 15 کھرب ڈالر تک پہنچ گیا، حکومت کیا بدلی قرض کا حجم بھی بدل گیا 2013 سے 2018 کے پانچ سالہ لیگی دور میں صرف اندرونی قرض کا حجم 30 ٹریلین ڈالر تک پہنچ گیا۔ کیا کہنے اس جمہوریت

کے۔ نوجوانوں سے بھی اظہار افسوس کہ حال کی تبدیلی کے خواب کے آگے مصلحتیں آگئیں۔ مافیا نے گلا گھونٹ دیا تبدیلی کا۔ اگر آپ نیب میں اینٹی کرپشن اور ایف آئی اے کو ضم کر دیتے تو کرپٹ لوگوں کو قبروں میں بھی جگہ نہ ملتی لیکن سرکار! آپ تو سرکار ملتے ہی ”آپ سرکار ہو گئے“ جبھی تو غیر ملکی نشریاتی ادارے نے نیب ترمیمی آرڈیننس کے پسِ پردہ حقائق پر بھگو بھگو کر کیا مارا ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال ہم آپ کو آپ کا نعرہ انصاف عام احتساب سر عام والا نعرہ یاد دلاتے رہیں گے۔

”فیس بک کا مارک زکر برگ“ ارب پتی کس طرح بنا

میکس دنیا کی پہلی بچی ہے جس کی پیدائش پر اس کے والد نے 45 ارب ڈالر صدقہ کر دیے یہ کسی بچی کی پیدائش پر انسانی تاریخ کا سب سے بڑا عطیہ سب سے بڑا صدقہ ہے یہ بچی کون ہے؟ اس کے والدین کون ہیں اور 45 ارب ڈالر کا یہ عطیہ کیوں دیا؟ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے یہ داستان 2004ء میں شروع ہوئی۔

2004ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک کمرے میں تین نوجوان رہتے تھے مارک ان تینوں میں نالائق سست اور شرمیلا تھا یہ اس وقت بمشکل 19 برس کا تھا یہ 1984ء میں نیویارک کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا والد دندان ساز تھا یہ خاندان کا چوتھا بچہ تھا تین بہنیں اس کے علاوہ تھیں اسکول میں نالائق اور غبی تھا یہ 2002ء میں ہارورڈ یونیورسٹی پہنچ گیا کمپیوٹر پروگرامنگ اس کا جنون تھا مارک نے 2004ء کے شروع میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر ویب سائیٹ کی ڈومین خریدی سوشل نیٹ ورک کی ویب سائیٹ ڈیزائن کی اور چار فروری 2004ء کو فیس بک ڈاٹ کام کے نام سے یہ ویب سائیٹ لانچ کر دی۔ اس ویب سائیٹ کا مقصد ہارورڈ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کے درمیان آن لائین رابطے پیدا کرنا تھا مارک نے ویب سائیٹ کے لیے تمام ڈیٹا اسٹوڈنٹس کے پروفائل ان کی تصویریں اور پتے یونیورسٹی کے ڈیٹا بینک سے لیے تھے یہ ویب سائیٹ جوں ہی انتظامیہ کے نوٹس میں آئی انتظامیہ نے ہیکنگ کا الزام لگا کر مارک کو نوٹس جاری کر دیا لیکن مارک پیچھے نہ ہٹا اس کے پاس اس وقت صرف ہزار ڈالر تھے اس نے اتنی ہی رقم اپنے ایک کلاس فیلو سیورن سے لی اور ویب سائیٹ کو مزید بہتر بنانا شروع کر دیا فیس بک یونیورسٹی طالب علموں کے لیے دلچسپ تجربہ ثابت ہوئی چار دن میں 650 طالب علموں نے فیس بک جوائن کر لی۔ یہ تعداد تین ہفتوں میں 6 ہزار تک پہنچ گئی 25 فروری کو کولمبیا یونیورسٹی کے طالب علم بھی فیس بک جوائن کرنے لگے اگلے دن یعنی 26 فروری کو سٹین فورڈ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس بھی فیس بک پر آ گئے اور 28 فروری کو ییل یونیورسٹی بھی مارک کی اس عجیب وغریب ایجاد پر نظر آنے لگی مارچ میں طالب علموں کی تعداد 30 ہزار تک پہنچ گئی مارک کو اب ویب سائیٹ ہینڈل کرنے کے لیے اسٹاف کی ضرورت تھی جیبیں خالی تھیں اور کاروبار مشکل چنانچہ مارک نے مجبوراً اپنے روم میٹ ڈسٹن موسکووٹز کو پانچ فیصد شیئر دے کر ساتھ ملا لیا۔ موسکووٹز اس وقت یہ نہیں جانتا تھا وہ ہاں جو اس نے ہنستے ہنستے کر دی تھی وہ اسے مستقبل میں کروڑ پتی بھی بنا دے گی اور وہ پوری دنیا میں مشہور بھی ہو جائے گا‘ مارک نے مارچ کے مہینے میں فیس بک پر اشتہارات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا پہلے مہینے کی کمائی ساڑھے چار سو ڈالر تھی کمپنی میں اپریل میں دس ہزار ڈالر کی مزید سرمایہ کاری ہوئی اس سرمایہ کاری نے فیس بک کو چھ ماہ میں امریکا کی 34 یونیورسٹیوں کے ایک لاکھ طالب علموں تک پہنچا دیا اور یہ وہ کامیابی تھی جس نے مارک پر ہارورڈ یونیورسٹی کے دروازے بند کر دیے وہ ہارورڈ سے نکلا اور سیدھا سلیکان ویلی پہنچ گیا اور مارک سے مارک زکر برگ ہو گیا۔ مارک زکر برگ نے پوری دنیا کو حیران کر دیا فیس بک کی مالیت صرف چار ماہ میں دس ملین ڈالر ہو چکی تھی لیکن مارک نے کمپنی بیچنے سے انکار کر دیا 2005ء کی گرمیوں میں جب فیس بک کے یوزرز کی تعداد دو لاکھ ہوئی تو پے پال کمپنی کے شریک بانی پیٹر تھیل نے فیس بک میں پانچ لاکھ ڈالر کی سرمایہ کاری کر دی یہ سرمایہ کاری یوزرز کی تعداد کو پانچ لاکھ تک لے گئی اور پھر اس کے بعد مارک نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا فیس بک اس وقت دنیا کی مقبول ترین سوشل میڈیا ویب سائیٹ ہے اس کے یوزرز کی کل تعداد ایک ارب 55 کروڑ ہے دنیا کے 145 ممالک کے لوگ فیس بک استعمال کرتے ہیں۔

دنیا کے تمام سربراہان لیڈرز اداکار گلوکار کھلاڑی رائٹرز صحافی بزنس مین اور دنیا کی تمام چھوٹی بڑی آرگنائزیشنز فیس بک پر موجود ہیں دنیا کا کوئی شخص زمین پر ہو یا نہ ہو لیکن وہ فیس بک پر ضرور ہوتا ہے دنیا فیس بک سے قبل سات براعظموں 145 ملکوں مختلف قومیتوں اور ہزاروں زبانوں میں تقسیم تھی لیکن یہ فیس بک کے بعد سمٹ کر ایک وال پر آ گئی آج امریکا ہو روس ہو یا افغانستان ہو صدر اوباما ہوں پیوٹن ہوں یا پھر اشرف غنی ہوں یہ تمام لوگ یہ تمام ملک فیس بک کے بغیر ادھورے ہیں لوگ اب یہ تک کہتے ہیں ڈھونڈنے والوں کو فیس بک پر خدا بھی مل جاتا ہے۔فیس بک نے مارک زکر برگ کو 23 سال کی عمر میں ارب پتی بنا دیا یہ دنیا کا پہلا نوجوان تھا جو 23 سال کی عمر میں ارب پتیوں کی فہرست میں شامل ہوا' یہ امریکا کا ساتواں امیر ترین شخص بھی ہے اور یہ دنیا کی ان 100 بااثر ترین شخصیات میں بھی شمار ہوتا ہے جن میں صدر اوباما ڈیوڈ کیمرون نریندر مودی اور پیوٹن جیسے لوگ شامل ہیں فیس بک میں اس وقت 10 ہزار ملازمین ہیں یہ سالانہ ساڑھے بارہ ارب ڈالر کماتی ہے اس کی روزانہ آمدنی تین کروڑ 34 لاکھ ڈالر اور ایک سیکنڈ میں 387 ڈالر ہے دنیا کی 56 کمپنیوں کا براہ راست روزگار بھی فیس بک سے وابستہ ہے۔ مارک زکر برگ کے پاس کمپنی کے 2.28 فیصد شیئرز ہیں ان شیئرز کی مالیت 45 ارب ڈالر ہے گویا اکیلا مارک زکر برگ پاکستان کے اسی فیصد قرضے ادا کرسکتا ہے یہ فیس بک کا چیئرمین ہے لیکن یہ اپنی خدمات کا صرف ایک ڈالر معاوضہ لیتا ہے یہ اس کی کل تنخواہ ہے اس نے مئی 2012ء میں پریسیلا چین کے ساتھ شادی کی بیگم عام سی ڈاکٹر ہے میکس ان کی پہلی اولاد ہے مارک زکر برگ نے بیٹی کی پیدائش پر اپنی 99 فیصد دولت خیرات کر دی یہ 45 ارب ڈالر بنتے ہیں یہ رقم اس کے قائم کردہ فنڈ میں شفٹ ہو جائے گی یہ اس رقم سے دنیا بھر کے مسکینوں بیماروں لاچاروں اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی مدد کرے گا یہ مہلک امراض کا علاج تلاش کرائے گا غریب ملکوں میں اسکول اور اسپتال بنوائے گا معذوروں کو مصنوعی اعضاء فراہم کرے گا اور غربت کے نچلے درجے میں زندگی گزارنے والوں کی مالی مدد کرے گا مارک زکر برگ نے اپنی 99 فیصد دولت عطیہ کرتے وقت اپنی بیٹی میکس کو ایک خط بھی لکھا یہ خط بھی شاہکار ہے مارک نے خط میں لکھا'' آپ کی والدہ اور میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعے ہم آپ کو یہ بتا سکیں آپ کے آنے سے ہمیں مستقبل کی کتنی امیدیں ملی ہیں آپ نے دنیا میں آ کر ہمیں اس دنیا کی طرف متوجہ کر دیا جس میں آپ نے زندگی گزارنی ہے'' مارک کا کہنا ہے میں اس دنیا کو اپنی بیٹی کے رہنے کے لیے بہتر جگہ بنانا چاہتا ہوں مارک نے دنیا کو بہتر جگہ بنانے کے لیے اپنی 99 فیصد دولت خیرات کر دی یہ اب فیس بک کے صرف ایک فیصد شیئرز کا مالک ہے۔آپ فیس بک کے اس ایک فیصد شیئر ہولڈر کو دیکھئے اور اس کے بعد اسلامی دنیا کے ان تمام شہزادوں کو دیکھئے جو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں آپ ان کے بعد پاکستان کے ان ارب پتیوں کو بھی دیکھئے جنھیں اللہ تعالیٰ نے رزق اور دولت سے نوازا اور آپ اس کے بعد ملک کے ان حکمرانوں کو بھی دیکھئے جنھیں اللہ نے دولت بھی دی شہرت بھی دی اور اقتدار بھی عنایت کیا اور آپ اس کے بعد سوچئے یہ کیسے لوگ ہیں جن کے سامنے خلقت بھوک سے ایڑھیاں رگڑتی ہے آپ تیل کی دولت سے مالا مال عرب ملکوں اور یورپ کے عوام کا موازنہ بھی کر لیجیے آپ کو یورپ کی مڈل کلاس عرب ممالک کے خوش حال ترین لوگوں سے بہتر زندگی گزارتی نظر آئے گی آپ پاکستان کے حکمرانوں اشرافیہ اور بزنس مین کلاس کو بھی دیکھ لیجیے۔یہ لوگ دہائیوں سے اپنے بچوں کو اس دنیا میں چھوڑ کر جا رہے ہیں جس میں بیماری افلاس جہالت اور جرائم کے انبار لگے ہیں بھٹو کا خاندان 45 برسوں میں لاڑکانہ کو پینے کا صاف پانی اچھی تعلیم معیاری اسپتال اور کرائم فری ماحول نہیں دے سکا باچا خان کے خاندان نے آج تک چارسدہ کی حالت نہیں بدلی مولانا فضل الرحمن آج تک ڈی آئی خان کو نہیں بدل سکے اور شریف فیملی آج تک لاہور کو اتنا صاف ستھرا اور محفوظ نہیں بنا سکی کہ ان کے پوتے اور پوتیاں سیکیورٹی کے بغیر باہر نکل سکیں سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کر سکیں گورنمنٹ کے اسپتال میں علاج کرا سکیں اور ٹونٹی کا پانی پی سکیں یہ کیسے لوگ ہیں؟ یہ خود کو اللہ تعالیٰ کی مقدس قوم بھی کہتے ہیں یہ کلمہ بھی پڑھتے ہیں قرآن مجید کی تلاوت بھی کرتے ہیں اور باقاعدگی سے نماز بھی ادا کرتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو بدترین ماحول بھی دے رہے ہیں! یہ کیسے مسلمان ہیں یہ کیسے پاکستانی ہیں اور یہ کیسے انسان ہیں یہ ایمان کے دعوے دار ہیں لیکن 31 سال کا ایک نوجوان صدقے اور خیرات میں ان سے لاکھوں کوس آگے نکل گیا یہ ایمان کے ڈھول پیٹتے رہ گئے اور بے ایمان ملک کا ایک بے ایمان نوجوان ایمان کی پوری دکان لوٹ کر لے گیا۔

کیا مسلمانوں کے پاس مارک زکر برگ کا کوئی ایک متبادل ہے کوئی ایک ایسا متبادل جو اپنی 99 فیصد دولت انسانیت کے لیے وقف کر دے جو اپنے بچوں کو بہتر دنیا دینے کے لیے اپنی ساری دولت لٹا دے؟ میں مسلمانوں کو اس دن مسلمان سمجھوں گا جس دن یہ مارک زکر برگ جیسا ایک انسان پیدا کر لیں گے ایسا مارک زکر برگ جو اپنی ساری دولت اپنی بیٹی کے نام پر صدقہ کر دے اور جو عین جوانی میں اپنا مال انسانیت کے نام وقف کر دے! (منقول)

بونوں کا دیس

تحریر: (سہیل وڑائچ)

یہ ایک فرضی قصہ تھا مگر اس کے اندر علامتوں، معانی اور تشریحات کی ایک دنیا آباد تھی اس لیے اسے بہت شہرت ملی۔ انگریزی ادیب جوناتھن سوئفٹ کی ’’گلیورز ٹریولز‘‘ کو ادب اور سیاست دونوں میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ سوئفٹ نے للّی پٹ (Lilliput) کے ایک جزیرے کا ذکر کیا ہے جہاں چھ انچ قد کے بونے آباد تھے۔ ان کی اپنی اقدار اور اصول تھے۔ سوئفٹ نے بونوں کے دیس کی کہانی اپنے تخیل کی بنیاد پر لکھی اور اس کہانی کی علامات کے ذریعے برطانیہ اور دیگر ریاستوں کے اندر درباری سازشوں، خوشامدیوں اور مصنوعی کرداروں پر تنقید کی۔ یہ بونے فرضی اور تخیلاتی تھے مگر پروفیسر یوول نوح حراری کی تازہ کتاب "Sapiens" ’’انسان کی مختصر تاریخ‘‘ میں یہ سائنسی انکشاف کیا گیا ہے کہ ارتقا کے مراحل سے گزرتے ہوئے آج کے انسان (Homo sapiens) سے 12 ہزار سال پہلے فلور جزیرے پر بونوں کی ہڈیاں اور آثار ملے ہیں، البتہ بونوں کی اس نسل کے جین آج کی انسانی نسل میں بھی موجود ہیں۔ سوئفٹ کے بونے ہوں یا پروفیسر حراری کے اصلی انسانی بونے، یہ عقل میں پورے انسان تھے ان کے صرف قد چھوٹے تھے، دماغ اتنے ہی بڑے تھے جتنے آج کی انسانی نسل کے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے کہ بونے کا قد نہیں دل ناپو تبھی اس کے ارادوں کا علم ہوگا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ بونے ہمیشہ بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں خود ایک بونا ہوں اور بونوں کے دیس میں رہتا ہوں۔ اس دیس کے بونے صرف قد کے نہیں عقل کے بھی بونے ہیں۔ نفرت سے بھرے، حسد سے لتھڑے، سازش سے لدے اور شر کی دولت سے مالا مال، اپنے کسی بھی ہم ذات کی ترقی سے خوف زدہ، اس کی جیت پر رنجیدہ اور ہر وقت آمادۂ بغاوت، شوریدہ سر بھی نہیں اور مطمئن و قانع بھی نہیں، تضادات سے بھرپور ہم بونے خود کو بہت بڑا سمجھتے ہیں۔ اتنا بڑا کہ ہم اپنی خامیوں کا جائزہ لینے ہی کو تیار نہیں۔ پروفیسر یوول نوح حراری کے مطابق آج تک کی سائنسی تحقیق کے مطابق جو قدیم ترین انسانی نام سامنے آیا ہے وہ ’’کشتم‘‘ ہے۔ اسی طرح جو سب سے پرانی تحریر دستیاب ہوئی وہ گندم کے حساب کتاب پر مبنی ہے اور انسانی موجودی کا سب سے پہلا احساس نشان انگوٹھا لگا کر کیا گیا۔ یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ چھ قسم کی انسانی نسلوں اور قسموں کا سراغ ملتا ہے جن میں بونوں کی نسل کے علاوہ پانچ اور بھی قسمیں تھیں لیکن بالآخر موجودہ انسانی نسل Homo Sapiens نے سب کی جگہ لے لی اور پچھلے سیکڑوں سالوں سے پوری دنیا میں ایک بھی ذی نفس ایسا نہیں ملتا جس کا تعلق کسی اور انسانی قسم سے ہو۔ بونے قد کے باشندوں کے دیس میں اگر فیصلے بالشتیے قد کے لوگ کریں، تو کوئی حیرانی نہیں کہ ہم سب بالشتیے ہیں۔ حیرانی اور پریشانی تب ہوتی ہے کہ ہم قد کے بالشتیے، سوچ کے بھی بالشتیے اور فکر کے بھی بونے نکلتے ہیں۔ ہمیں اپنی ناک سے آگے کچھ نظر نہیں آتا، قد کا بالشتیہ ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن سوچ اور فکر کا بالشتیہ یا بونا ہونا ملک وقوم کو نقصان دیتا ہے۔ بونوں کے انتخابات ہوئے۔ سب بونوں کو توقع ہے کہ اب ایک نیا ملک بنے گا جہاں کرپشن ہوگی نہ بے انصافی، جہاں روزگار ملے گا اور خوش حالی ہوگی۔ بظاہر یہ سہانا خواب پورا ہونے میں چند ہی دن باقی ہیں لیکن بونوں کی ذہنیت وہی رہی، وہی سازشیں، وہی دھڑنے، وہی بائیکاٹ اور وہی اقتدار کی رسہ کشی جاری رہی تو احتمال ہے کہ بونوں کا نیا دیس ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔ ضلع گجرات کے نواح میں جگہ جگہ لمبی لمبی قبریں نظر آتی ہیں۔ مشہور یہی ہے کہ یہ نوگزوں کی قبریں ہیں اور ساتھ ہی یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک زمانے میں انسان کا قد بہت لمبا یعنی نوگز کے قریب ہوتا تھا۔ پروفیسر یوول نوح حراری یا کسی اور سائنسی تحقیق یا دریافت میں البتہ ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ انسانی نسل کی کوئی اتنی لمبی قسم کبھی اس دنیا میں رہی ہو۔ سائنسی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ سوائے بونوں کے انسان کا قد کم وبیش اتنا ہی رہا ہے جتنا اب ہے۔ اصل تبدیلی دماغ کے سائز میں آئی۔ دماغ کا سائز بڑا ہوا تو سوچ بچار اور سماجی رابطہ اور گپ شپ کا سلسلہ شروع ہوا، جس سے انسانوں کے گروہ میں تعاون بڑھا اور پہلے قبیلے اور پھر معاشرے بنتے گئے۔ انسانی نسل کی ترقی میں ایک بڑی تبدیلی اس وقت آئی، جب اس نے چار پایوں کے بجائے دو پایوں پر چلنا سیکھ لیا۔ دو ہاتھ فارغ ہوئے تو دماغ اور دو فارغ ہاتھوں سے اوزار بنائے اور نت نئی ایجادات شروع کردیں۔ یاد رکھیں کہ بونوں والی سوچ بدلنا ہوگی ظالمانہ احتساب کے نام پر ہر اپوزیشن کو انتقام کا نشانہ بنانا آسان ہے اور اس کی بجائے اپنے سمیت سب کا منصفانہ احتساب کرنا مشکل ہے۔ دنیا بھر کے پیمانے، معیارات اور روایات بدل چکیں۔ ہمیں بھی بالشتیوں سے انسان بننا ہوگا۔ ہمیں بھی چھوٹے قد اور چھوٹے ذہن سے آگے بڑھ کر قد آور بننا ہوگا۔ ایک ایسے ملک اور ایسی ریاست کی بنیاد رکھنا ہوگی، جس

میں سب کا تحفظ اور سب کا احترام ہو۔حکومت محب وطن اور اپوزیشن غدار قرار نہ دی جائے۔ جہاں ریاست کے طاقت ور گروہ، عوام کے منتخب نمایندوں کو شریک اقتدار نہ کریں، بلکہ انتقال اقتدار کریں۔ہم بونے ضرور ہیں مگر ہم اگر اپنی سوچ بڑی کرلیں، دماغ کو کھول لیں تو ہم بھی دنیا بھر کی طرح بدل سکتے ہیں۔ اس دیس میں بھی سازشوں، دہشت گردی اور بے یقینی کے سائے ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتے ہیں۔ہم وہ قوم ہیں جنھیں بدلنے اور اپنے آپ کو بہتر کرنے کے بے شمار مواقع ملتے رہے ہیں اور ہم ہر موقع کو ضائع کرتے رہے ہیں۔ جب بھی ایسا موقع ملا ہم نے اپنے ذہن کو نہیں بدلا اور وہی غلطیاں دہرائیں جو پہلے دہراتے رہے۔ہم بونوں کو ایک بار پھر سے نیا موقع ملا ہے۔موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو توقعات اور خوش حالی کا سفر شروع ہوسکتا ہے۔ہم بھی مہذب جمہوری، معاشرہ بن سکتے ہیں۔ہم بھی اپنے معاملات خود بیٹھ کر طے کر سکتے ہیں۔ اگر جنوبی افریقہ میں کالے اور گورے نسلی منافرت ختم کر سکتے ہیں تو ہم سرخ، سبز اور سیاہ کے دائروں سے نکل کر ایک قوم کیوں نہیں بن سکتے؟ (بشکریہ روزنامہ جنگ)

ہماری دعائیں بے اثر کیوں ہیں؟

تحریر: خطیب احمد

خالق کائنات نے تمام انسانوں کو اس دنیا میں یکساں پیدا کیا ہے۔بعض میں کوئی پیدائشی نقص ہوتا ہے لیکن اکثریت جسمانی اور ذہنی اعتبار سے درست ہوتی ہے۔ وہ انسان جسے رب کائنات نے یکساں پیدا فرمایا، وہی انسان رنگ، نسل، زبان اور مذہب میں منقسم ہوجاتا ہے۔ پھر وہ جس گروہ سے وابستہ ہوتا ہے، اسی گروہ کے عقائد اور قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے روایتی طریقے سے خدا کی عبادت کرتا ہے۔لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ جب انسان خدا سے

دعا مانگتا ہے یا التجا کرتا ہے، تو اس سے قبل انسان کو عمل بھی انجام دینا ہوتا ہے تاکہ اس کے حوالے سے وہ خدا کے سامنے اپنی مانگ رکھ سکے۔ دنیا میں ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمان ہیں مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں، حالانکہ یہ تواتر کے ساتھ مذہبی رسوم بھی ادا کرتے ہیں پھر بھی لگتا ہے کہ کوئی کمی ہے جس وجہ سے وہ دعائیں قبول نہیں ہوتی ہیں۔ اگر مزید دقیق نظر سے زمینی حقائق کا جائزہ لیں تو معلوم ہوجائے گا کہ ہماری ہر بات عمل سے بالکل خالی ہے۔اب ذرا تھوڑی سی توجہ غیر مسلموں پر کرلیتے ہیں۔ خدا نے ان کو بھی وہ ہی دو ہاتھ، دو پاؤں اور دماغ دیئے ہیں۔ وہ بھی اپنے تہوار مناتے ہیں اور اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد پر دعائیں کرتے ہیں؛ اور ہر میدان میں ہم سے آگے ہیں۔ ہر جنگ میں جیت بھی جاتے ہیں کیونکہ یہ کائنات کچھ اصولوں پر چلتی ہے۔ وہ اصول رنگ، نسل، زبان اور مذہب سے بالاتر ہوتے ہیں۔ان اصولوں پر جو عمل کرتا ہے، ترقی اس کا نصیب بن جاتی ہے۔جب دنیا وجود میں آئی تھی، تب ہی سے یہ طبیعی قوانین وجود میں آ گئے تھے۔ مثلاً سر میں درد ہو تو اس کی ایک جیسی گولی ہر انسان کی ضرورت ہے، چاہے وہ پادری ہو یا مسجد کا امام ہو۔ دور دراز فاصلوں پر رابطے کے لیے فون کی ضرورت سب کو ہے چاہے وہ کوئی ملحد ہو یا کوئی مسلمان۔ لہٰذا ضرورت کی یہ اور ان جیسی دوسری اشیاء جو بھی تخلیق کرے گا، وہ دنیا میں ترقی کرتا جائے گا اور دنیا میں اپنا لوہا منوالے گا۔ اگر آپ تھوڑا سا اپنے دماغ پر زور ڈالیے تو معلوم ہوجائے گا کہ آج تمام مسلم ممالک ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے کو بھی تیار نہیں مگر مساجد میں امت مسلمہ میں اتحاد کی دعائیں کرتے ہیں۔لیکن پھر وہ ہی سوال کہ ہماری دعائیں بے اثر کیوں ہیں؟

ولیم ڈیلرمپل نے اپنی مشہور کتاب The Anarchy میں بتایا ہے کہ کس طرح انگریزوں کے ایک چھوٹے گروہ نے برصغیر کی مغل سلطنت کا خاتمہ کر کے آبادی کو غلام بنالیا تھا۔اس سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہت کے لالچ میں تھے جبکہ انگریز بحیثیت قوم متحد تھے۔ دراصل امریکا اور یورپ نے جو ترقی کی ہے وہ اس لیے نہیں کی کہ وہ گرجا گھروں میں جا کر اپنی سربلندی کی دعائیں کیا کرتے تھے؛ بلکہ دنیا میں طاقت کے کچھ اصول ہوتے ہیں، جنہیں اپنانے کے بعد ہی ہر قوم ترقی کی بلندیوں کو چھو سکتی ہے۔ جب تک ہم اِس دنیا میں انسانیت کی بقا و سلامتی کے لیے اپنی خدمات انجام دیتے رہیں گے، تب ہی اپنا نام روشن کر پائیں گے، اس دنیا میں ترقی کرسکیں گے...... کیونکہ اپنے لیے زندگی بسر کرنے والوں کو لوگ بھول جاتے ہیں جبکہ انسانیت کے لیے زندگیاں وقف کرنے والے افراد کو دنیا ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔

قادیانی نہ اقلیت ہیں نہ اکثریت

تحریر: حمد فاتح ملک

بھارت میں جو کچھ پچھلے ایک سال میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے اس پر عمران خان صاحب اور ان کی ٹیم نے اپنی تقریروں اور سوشل میڈیا پر بہت کچھ کہا ہے۔ ہر دوسرے دن وہ اس طرف عالمی دنیا کی توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ کشمیر میں بھارتی مظالم اور ہندوستان میں مسلمانوں سے ہونے والے امتیازی سلوک اور مظالم کی طرف وزیر اعظم اور ان کی ٹیم، خاص کر سوشل میڈیا ٹیم، دنیا کی توجہ کھینچنے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالات کوئی بھی ہوں، کرونا کی وجہ سے دنیا پریشان ہو یا عالمی منڈی میں کساد بازاری ہو، وزیر اعظم اور ان کی ٹیم بھارت کے مظالم کو بیچ میں لے ہی آتی۔ اقوام متحدہ میں انہوں نے بھارتی مظالم کی طرف جب دنیا کی توجہ مبذول کروائی تو بڑی واہ واہ ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے پاکستان میں اقلیتوں کے تحفظ کے بارے میں بھی دنیا کو بہت کچھ بتایا۔ اپنی متعدد ٹویٹس میں جناب وزیر اعظم صاحب سکھوں، ہندوں، مسیحیوں کے حقوق کی بات کرتے رہے۔ بلکہ ہندوستان کو طعنے بھی دیتے رہے کہ ایسے اقلیتوں کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔

لیکن یہ سب تصویر کا ایک رخ ہے۔ یہ رُخ دیکھنے والوں کو خوب لبھاتا ہے اور اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ پاکستان نام کے ہاتھی کے دیکھنے والے دانت ہیں کھانے والے نہیں۔ اگر آپ نے تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا ہو تو USCIRF کی جاری کردہ رپورٹ پڑھ لیں جیسے جاری ہوئے ابھی چند دن گزرے ہوئے ہیں۔ یہ رپورٹ اس لنک پر دیکھی جا سکتی ہے

https//:www.uscirf.gov/news-room/press-releases-statements/uscirf-releases-2020-annual-report-recommendations-us-policy

اس رپورٹ میں 14 ممالک کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا جہاں اقلیتوں سے ناروا سلوک برتا جاتا ہے۔ ان میں سے 9 ممالک تو پچھلے سال دسمبر میں آنے والی رپورٹ میں بھی شامل تھے۔ جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ (یاد رہے کہ پاکستان ان ممالک کی فہرست میں کئی سالوں سے مسلسل شامل آ رہا ہے۔) جب کہ 5 ممالک ایسے تھے جنہیں اس سال دوبارہ شامل کیا گیا جس میں بھارت بھی شامل تھا۔ 2004 کے بعد یہ پہلا موقعہ ہے جب USCIRF نے بھارت کو خاص طور پر قابل توجہ ممالک میں شامل کیا۔

جب یہ رپورٹ آئی تو محترم شہباز گل صاحب نے سوشل میڈیا پر خوب واویلا مچایا۔ انہوں نے یہ بتایا کہ بھارت کو اس فہرست میں شامل کیا جانا بتاتا ہے کہ بھارت میں کیا مظالم ہو ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنی ٹویٹ کچھ دیر بعد ڈلیٹ کر دی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ انہیں کسی نے توجہ دلائی ہوگی کہ انگریزی کی رپورٹ پوری پڑھ لیں تو شاید معلوم ہو کہ بھارت سے پہلے پاکستان کا نام موجود ہے۔ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ کے ساتھ انٹرنیٹ پر موجود ہے۔

https//:www.uscirf.gov/sites/default/files/Pakistan_Urdu.pdf

https//:www.uscirf.gov/sites/default/files/Pakistan.pdf

اس رپورٹ کو شاید وزیر اعظم عمران خان صاحب نے پڑھا ہوگا یا انہیں کسی نے بتایا ہوگا۔ اس رپورٹ کے شائع ہونے کے صرف دو دن بعد یہ خبر گردش کرنے لگی کہ قومی اقلیتی کمیشن کی از سر نو تشکیل ہوگی۔ اور اس دفعہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار قادیانیوں/ احمدیوں کو بھی اس کا رکن بنایا جائے گا۔ اور عمران خان صاحب کے کہنے پر یہ سب ہو رہا ہے۔ اس خبر کا سامنے آنا تھا کہ نام نہاد علماء کے ساتھ ساتھ نام نہاد صحافیوں نے بھی اس کے خلاف خوب زبان درازی کی۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ وزیر اعظم کی پارٹی کے اپنے وفاقی وزیر نے قادنیوں کی سزا ''سرتن سے جدا'' کی ٹویٹ بھی کی۔ اور سوشل میڈیا پر جو لگاتار کئی دن احمدیوں / قادیانیوں کے خلاف ٹرینڈ چلتا رہا اور پہلے روز تو پہلے 5 ٹرینڈ میں سے 4 اسی موضوع پر تھے۔ سوشل میڈیا مافیا اور ٹرولرز نے اس پر اس مذہبی اقلیتوں کو خوب گالیاں دیں اور سزائیں جاری کیں۔ اس موقعہ پر جن وزیروں اور صحافیوں کے سوشل میڈیا اکاونٹس سارا دن آگ برساتے ہیں وہ ایسے ماند پڑ گئے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ سوائے اکا دکا کہ جو آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ سوشل میڈیا کے ان ٹرینڈز میں کس قدر گالیاں تھیں اس کا اندازہ آپ وفاقی وزیر کی ایک ٹویٹ سے لگا سکتے ہیں۔ ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کی ٹویٹس اس کے

علاوہ بھی جو جاہل بھی ہیں اور کالانعام بھی۔ روزانہ عالمی دنیا کے سامنے ''ہندوتوا'' کا راگ الاپنے والے اپنے ملک میں قادیانی قادیانی کھیل پر بالکل خاموش تماشائی بنے رہے۔ خیر حتمی منظوری کابینہ نے دی، وزیر اعظم صاحب حسب سابق یوٹرن لے گئے اور یہ نوتشکیل شدہ اقومی اقلیتی کمیٹی کسی بھی ''قادیانی کے شر'' سے محفوظ رہی۔ پاکستان کی 96 فیصد آبادی مسلمان ہے۔ اور اس کے علاوہ جو بھی ہیں وہ اقلیت ہیں۔ 1974 سے قبل احمدی اکثریت میں شمار ہوتے تھے کیونکہ وہ مسلمانوں کا ایک فرقہ شمار کئے جاتے تھے۔ یہ لوگ اسمبلی کا حصہ بھی تھے۔ بلکہ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ جنہیں بانی پاکستان قائداعظم نے خود وزیر خارجہ بنایا تھا وہ بھی احمدی تھے۔ اسی طرح مشیر ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف حکومتی کمیٹیوں اور اداروں میں احمدی فائز تھے۔ 1974 میں دوسری آئینی ترمیم کے بعد احمدی سرکاری کھاتوں میں اکثریت کی بجائے اقلیت میں شمار کئے جانے لگے۔ لیکن عملاً وہ پہلے کی طرح نہ اقلیت شمار ہوتے رہے نہ اکثریت۔ اور پھر ان کا کوئی نمائندہ قومی اسمبلی میں نہیں آیا۔

اب سوال یہ ہے کہ احمدی اقلیت ہیں یا اکثریت؟ (قطع نظر اس کے کہ وہ خود اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں یا غیر مسلم)۔ حکومت اور پاکستان کا آئین کہتا ہے کہ وہ ''غیر مسلم'' ہیں اس وجہ سے اقلیت ہیں۔ اور دوسری طرف آج تک کسی اقلیتی کمیٹی میں بھی بطور نمائندہ احمدیوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ گویا عملاً اس بات کی بھی نفی کی جاتی ہے کہ وہ اقلیت ہیں۔

ان سب باتوں کا جائزہ لینے کے بعد کیا وزیر اعظم صاحب اور ان کی ٹیم یہ حق رکھتی ہے کہ وہ بھارت اور کشمیر میں ہونے والے اقلیتی سلوک کے بارے میں آواز بلند کریں جبکہ ان کا اپنا ہاتھ اسی خون سے آلودہ ہے؟ کیا دوسری اقلیتی برادریوں کے ساتھ ہمدردی کی ٹویٹس کرتے ہوئے کبھی انہوں نے احمدیوں کے بارے میں کوئی ٹویٹ کی؟ احمدیوں/ قادیانیوں کو مسلم شمار کرکے اکثریت میں شمار کرنے سے ان کا ''ایمان'' ضائع ہوتا۔ اقلیت شمار کرنے سے وہ ''اسلام کے غدار'' بنتے۔ پھر سوال یہ ہے کہ قادیانی اقلیت ہیں یا اکثریت؟ خود ان کے پاس حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مسلم کہیں یا غیر مسلم۔ یہ حکومت اور آئین ان کا مذہب بیان کردے بس اسی کو ماننا ان کا نصیب ٹھہرا ہے۔ تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ اقلیت میں آتے ہیں نہ اکثریت میں۔ معلوم نہیں حکومت انہیں انسانوں میں بھی شمار کرتی ہے یا نہیں کیونکہ اس بارے میں ابھی تک کوئی حکومتی فیصلہ نہیں آیا۔ امید ہے جلد ہی آجائے گا۔

❁❁❁

* براہ کرم اسے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ پڑھیں *

آئیے یہ مان لیں کہ احمدی غیر مسلم ہیں، وہ ختم نبوت کی تردید کرتے ہیں چاہے ہم انہیں بتائیں یا اپنے آئین میں لکھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کے منفی اثرات کے بارے میں سوچیں وہ اب بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ ہمارے کہنے کے باوجود دنیا ان کے ساتھ ہمدردی کرتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان سے نفرت کرتے ہیں اور ان کو قتل کرتے ہیں۔ انہیں مسلمان کہنے سے روکنا۔ صرف اس لئے کہ وہ اقلیت ہیں سوچئے کہ کیا ہم اقلیت کا حصہ ہیں؟ ہمیں کیسا محسوس ہوگا اگر ہمیں زبردستی مسلمان نہ کہنے پر مجبور کیا جائے؟

دنیا ہم پر مذہب میں مداخلت کرنے پر تنقید کرتی ہے۔ ایمان ذاتی ہے۔ ریاست کا معاملہ نہیں دنیا کیوں اہم ہے؟ کیونکہ ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے سامنے بھکاری ہیں! ہم ان سے نمٹنے میں سخت ناراضگی اور نادانی کو ظاہر کرتے ہیں اس طرح ہم احمدیوں کو اسلام سے دور لے جارہے ہیں!

اگر ہم ان کے ساتھ اچھے ہیں تو ہم ان کو بچانے میں مدد کر سکتے ہیں!

براہ کرم بڑی تصویر دیکھیں۔ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی نرم مزاج تھے اور ان کی وجہ سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ہے! اسلام کو خطرہ لاحق ہے کیونکہ ہم اسلام کی پیروی نہیں کرتے! اگر ہم اسلام کی صحیح پیروی کرنا شروع کردیں۔ ایمان پر لڑنا نہیں۔ دنیا ہمارا احترام کرے گی۔ اس طرح ماضی میں اسلام پوری دنیا میں پھیل گیا۔ یہ ایک بار پھر کرسکتے ہیں۔ ہمیں صرف صبر، ایمان اور محبت کی ضرورت ہے ہم اپنے غصے سے زیادہ کیوں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی نہیں کرتے ہیں؟ شفقت اور محبت کے ساتھ؟

میں آپ سے کہتا ہوں، ہر انسان ہمارے عشق کا مستحق ہے، ہمارے فیصلے کا نہیں! یہ اللہ کا کام ہے، ہمارا نہیں!

برائے مہربانی یاد رکھیں ہر انسان کا دشمن دوسرا انسان نہیں ہوتا ہے۔ یہ شیطان ہے۔ وہ ہمیں ایک دوسرے سے لڑنے اور نفرت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک دوسرے سے پیار کرکے ہم اسے شکست دے سکتے ہیں! اور سب کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کے قریب لائیں۔

❁❁❁

ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل

علامہ اقبالؒ اور وادئ جنت نظیر کشمیر

تحریر: انشال راؤ

اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کو کشمیر سے جذباتی روحانی اور ایسی بے پناہ محبت تھی کہ اُس کا اظہار اُنہوں نے اپنے کلام خطوط اور عمل سے کئی مواقع پر کیا۔ علامہ اقبالؒ کے بزرگوں کا تعلق کشمیر سے تھا۔ اُنہیں اِس پر ناز تھا کہ اُن کی شریانوں میں دوڑنے والا لہو کشمیر کے شفق فام چناروں کی طرح سرخ ہے۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں کہ

تنم گلے زخیابانِ جنت کشمیر
دلم ز خاکِ حجاز و نواز شیراز است

یعنی کہ ''میرا بدن گلستان کشمیر کا ایک پھول ہے اور میرا دل ارض حجاز اور میری صدا شیراز سے ہے''۔ کشمیر سے جدی تعلق رکھنے کے باوجود اُنہیں اس امر کا بھی گہرا احساس تھا کہ وہ اِس وادئ جنت نظیر کا مشاہدہ بچشم خود نہیں کر سکے۔ یہ احساسِ محرومی اشعار کے قالب میں یوں ڈھل کر سامنے آیا

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اِس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے
موتی عدن سے، لعل ہوا یمن سے دور
یا نافہ غزال ہوا ختن سے دور
ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

سیالکوٹ سے جب وہ لاہور پہنچے تو یہاں اُنہوں نے کشمیری مسلمانوں کی قائم کردہ تنظیم ''انجمن کشمیری مسلمانان'' میں شمولیت کی اور اس حد تک اس کے سرگرم کارکن بنے کہ اُنہیں اس انجمن کے ذمہ داران نے انجمن کا سیکرٹری جنرل بنا دیا۔ اقبال کشمیر، پنجاب اور ہندوستان بھر میں کشمیری مسلمانوں کی حالتِ زار پر کڑھتے اور اسے بہتر بنانے کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ اُن کا عہد شباب ہی میں یہ مطالبہ تھا کہ کشمیریوں کو ریاست کے ڈوگرہ حکمران اپنے گھروں کو واپس جانے دیں۔ اُنہیں وہاں آباد ہونے اور اپنی امداد کے خود مالک ہونے کا حق دیا جائے۔ اُن کی کشمیر سے والہانہ محبت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک موقع پر اُنہوں نے فرمایا

سامنے ایسے ، گلستاں کے کبھی گھر نکلے
حبیب خلوت سے ، سرطور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلی گر مولائے خلیل
عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

وہ 1921ء میں کشمیر گئے۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ ان کی میزبانی کے خواہش مند تھے لیکن اُنہوں نے مہاراجہ کا مہمان بننا قبول نہیں کیا۔ وہ اس وادی جنت نظیر کے مختلف شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں گھومتے پھرتے رہے۔ وادی کے

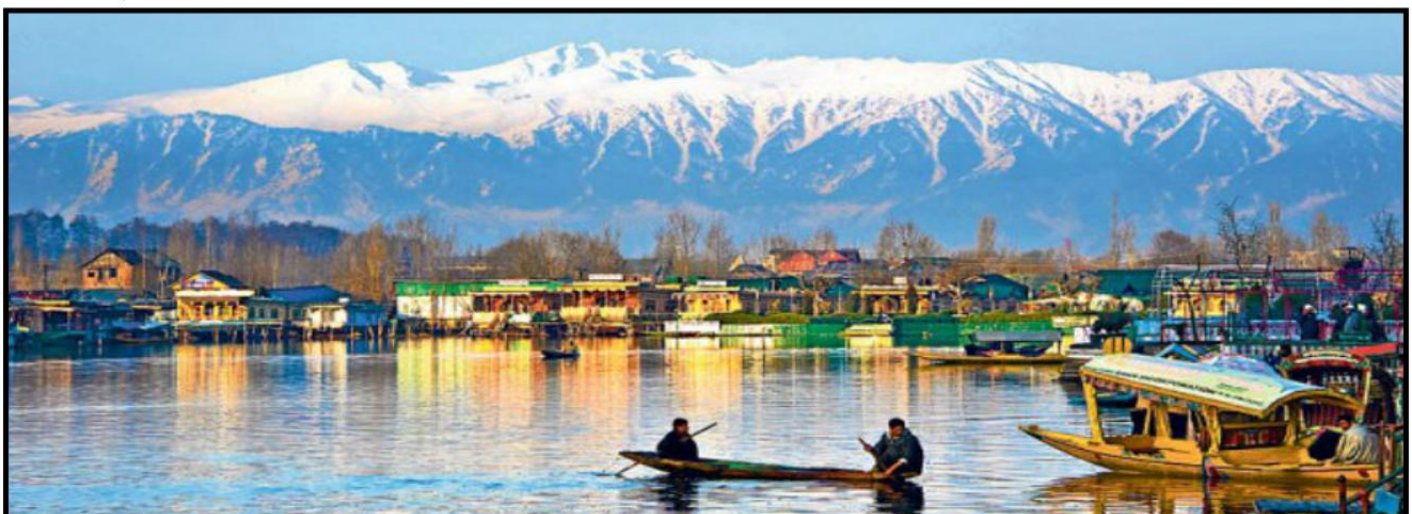

قدرتی حسن سے مسحور ہوتے رہے اور انہوں نے اس دوران اپنی آنکھوں سے کشمیری مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات کا جائزہ لیا۔

واضح رہے کہ مقبوضہ وادی جموں کشمیر میں آزادی کی تحریک 1931ء میں شروع ہو چکی تھی۔ اُنہوں نے اپنے کلام میں کشمیری مسلمانوں کو محکومی اور مظلومی کی زنجیریں توڑنے کا پیغام دیا اور اُن کے دل کے آتش کدے میں آزادی اور حریت کے انگاروں کو اپنے گرم جذبات کی سانسوں سے بھڑکایا۔ اقبال کی ایک مشہور کتاب جاوید نامہ ہے۔ دراصل یہ پوری کتاب کشمیری مسلمانوں کو غلامی کی زنجیریں توڑ دینے کا پیغام دیتی ہے۔ علامہ نے اس طویل مثنوی میں کشمیر پر ایک پورا باب رقم کیا ہے وہ عالمی تخیلات میں کشمیر کے عظیم صوفیاء اور بزرگ شاعروں سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ اپنی اس تخیلاتی اور تصوراتی ملاقات کے دوران اقبال کشمیر کے مشہور بزرگ میر سید علی ہمدانی المعروف حضرت شاہ ہمدانؒ سے بھی ملاقات کرتے ہیں اور اُن کے حضور اپنی یہ شکایت رکھتے ہیں کہ ''آپ کے ماننے والوں کو آج ستم کی تیغ کچل رہی ہے۔ آپ نظرِ کرم فرمایئے ہماری شکایت پر توجہ دیجئے، ہمیں بتایئے آپ کی مدد کب پہنچے گی، اس مثنوی میں وہ فارسی زبان کے ایک عظیم صوفی شاعر غنی کاشمیری سے بھی مکالمہ کرتے ہیں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اقبال کے قلب و قلم میں کشمیر رچا بسا تھا۔ 1939ء میں علامہ اقبال وفات پا گئے۔ اس عالمِ فانی سے دنیائے بقا کے سفر پر روانہ ہونے سے قبل بھی وہ مظلوم، مجبور اور محکوم کشمیریوں کے حوصلوں کو آواز دیتے رہے۔ انہوں نے انہی دنوں یہ دعا کی تھی کہ ''توڑ اس دست زجفا کیش کو یارب...... جس نے روحِ آزادی کشمیر کو پامال کیا'' علامہ کو دُکھ تھا کہ انگریزوں نے مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرا سے 75 لاکھ نک شاہی سکوں کا تاوان وصول کر کے پوری وادی اس جابر اور سفاک حکمران کے حوالے کر دی۔ علامہ اقبال نے 1931ء میں مظلوم کشمیریوں کی جدوجہد کو منزل آشنا کرنے کے لئے آل انڈیا کشمیر کمیٹی بھی بنائی۔ بعد از اں انہیں اس کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا لیکن بعض مصروفیات کی وجہ سے وہ آل انڈیا کشمیر کے منصب صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن ایک فعال کارکن کی حیثیت سے اس کے تمام اجلاسوں میں باقاعدگی سے شامل ہوتے رہے۔

جاوید نامہ کے علاوہ علامہ اقبال نے اپنی کتاب ''ارمغان حجاز میں'' ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض کے عنوان سے کئی نظمیں لکھیں۔ پہلی نظم میں وہ لکھتے ہیں

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب

تیسری نظم میں وہ کشمیر اور کشمیریوں کی حالتِ زار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر!
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر!
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطا و امیر
کہہ رہا ہے داستان بیدردئ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانہ دہقان پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ!
ہے کہاں روزِ مکافات؟ اے خدائے دیر گیر!

اقبال کو یقینِ کامل تھا کہ کشمیر میں آزادی کی جو تحریک شروع ہوئی ہے اِس کو دنیا کی کوئی طاقت دبا نہیں سکتی۔ آج بھارت کی ساڑھے 8 لاکھ افواج کے کشمیریوں کی تحریک حریت کی آگ کو سرد کرنے میں ناکام رہی۔ اسی تناظر میں علامہ فرماتے ہیں

جس خاک کے خمیر میں ہے آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

1990ء سے کشمیر میں گورنر راج نافذ ہے۔ ایک لاکھ حریت پسندوں کی مقبوضہ وادی کے مختلف شہروں اور قصبوں کے قبرستانوں میں زندہ قبریں برہان وانی اور اس کے پیروکاروں کو اقبال کے الفاظ میں یہ پیغام دے رہی ہیں کہ

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں!
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں
شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں

ضروری ادارتی نوٹ

1931 میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے اجلاس میں علامہ اقبال نے جماعت احمدیہ کے امام کو صدر بنانے کے لیے تجویز دی اور وہ منظور ہوئی۔ جب امام جماعت احمدیہ نے یہ صدارت چھوڑی تب یہ صدر ہوئے لیکن فوراً اس سے دست بردار ہو گئے۔

پاکستانی ڈراموں میں غیر حقیقی امور پر مبنی کہانیاں

تحریر: (ذیشان محمود۔ کراچی)

پاکستان میں پچھلے تین چار سال میں طلاق، حلالہ، ریپ اور بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی جیسے معاشرتی مسائل پر بننے والے ڈرامے کافی مقبول ہوئے۔ جن میں گھائل، سنگت، اُڈاری، روگ، مقابل، کتنی گرہیں باقی ہیں، چُپ رہو شامل ہیں۔ بعض ڈراموں پر پیمرا کی جانب سے پابندیاں بھی لگیں لیکن اس کے باوجود عوام نے انھیں بے حد پسند کیا۔ پاکستان میں Child abuse کے بڑھتے واقعات کے پیشِ نظر ڈرامہ انڈسٹری بھی اس طرف متوجہ ہوئی۔ کیونکہ اس موضوع پر بننے والے ڈراموں نے چینلز کو بہت TRP مہیا کی۔

تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ موضوعات ساری عوام کو پسند آئے ہوں۔ اسلام آباد یونیورسٹی کی لیکچرار شائلہ مدثر نے بی بی سی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ''کسی حد تک پاکستانی ڈراموں میں بہت ساری چیزیں ایسی دکھاتے ہیں جو ہماری سوسائٹی میں نہیں ہو رہیں مثلاً خاندانی سیاست اور گھریلو جھگڑے۔ یہاں ہوتے ہیں لیکن اتنے زیادہ نہیں یہ سب انڈین ڈراموں سے لیا گیا ہے۔''

پیمرا کی جانب سے مقامی انٹرٹیمنٹ ٹیلی وژن چینلز کو جاری کردہ نوٹس میں کہا گیا ہے کہ متنازع اور غیر اخلاقی موضوعات پر مبنی ڈراموں کی عکس بندی معمول بن گیا ہے اور نامناسب لباس و حرکات بھی آج کل کے ڈراموں کا خاصہ بن چکی ہیں جو ناظرین کے لیے ذہنی اذیت اور کوفت کا سبب ہے۔ پیمرا نے اپنے نوٹس میں کہا ہے کہ ڈراموں میں عورت کو جس انداز میں دکھایا جا رہا ہے ناظرین کی کثیر تعداد اس پر شدید تنقید کر رہی ہے۔ نوٹس میں تمام ٹی وی چینلز کو آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ ڈراموں میں ایسے موضوعات پیش کریں جو پاکستانی معاشرے کی حقیقی عکاسی کریں اور اسلامی، سماجی اور معاشرتی اُصولوں کے ہم آہنگ ہوں۔ ڈراموں کے ذریعے بے راہ روی اور برائیوں کو اجاگر کرنے سے گریز کریں۔ حساس موضوعات جیسے کہ طلاق اور حلالہ سے متعلق مواد پیش کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

https//:www.bbc.com/urdu/entertainment

-46819858

پاکستان کے ڈراموں میں بعض دفعہ بہت ہی فضول قسم کی باتیں دکھائی جاتی ہیں۔ انہی دنوں ایک ڈرامہ سیریل ''سوتیلی ماں‌تا'' کے نام سے ایک نجی چینل پر نشر ہو رہا ہے۔ اس ڈرامے میں حقیقت کے برعکس یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیٹی دوسرے شخص کو بیچ دی اور بعد ازاں اپنی بیوی کو طلاق بھی دے دے۔ جس شخص نے یہ لڑکی خریدی اس نے اس کی مطلقہ سے شادی کر لی۔ اب یہ بچی اس غیر حقیقی باپ کی ربیبہ بن گئی۔ ربیبہ سے متعلق قرآن کریم کا واضح حکم ہے کہ سوتیلے باپ کی اس سے شادی نہیں ہوسکتی اور وہ ایک محرم رشتہ ہے۔ جبکہ ڈرامے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس بچی کا اصل باپ اپنی سابقہ بیوی سے دشمنی میں عدالت سے بچی کا کسٹڈی مانگتا ہے۔ بچی کا سوتیلا باپ جب وکیل کے پاس جاتا ہے تو وکیل اپنے مخالف کی اس بات کو بڑی اہم دلیل قرار دیتا ہے کہ بچی کے اس گھر میں سب غیر محرم رشتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غیر شرعی بات ہے۔ اسی دلیل پر ڈرامے کی آگے چلایا جا رہا ہے کہ بچی کا اصل باپ عدالت سے بچی کی کسٹڈی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جبکہ بچی بھی باپ کے پاس جانا نہیں چاہتی۔ اس بارہ میں پاکستان کا قانون جو بھی کہتا ہو۔ لیکن شریعت کے مطابق ربیبہ ایک محرم رشتہ ہے اور اس کے حوالہ سے باقی رشتہ بھی محرم میں شامل ہیں۔ نیز چچا، تایا، ماموں، خالہ زاد اور سسرالی رشتے تو حقیقی یا غیر حقیقی طور پر تو نامحرم ہی ہوتے ہیں۔ بے ایک گھر میں رہیں یا علیحدہ گھر میں۔ لیکن 10 سال سے کم عمر دکھائے جانے والے بچوں میں کیا محرم اور کیا نامحرم، جس کو جواز بنایا جائے۔ کچھ دن قبل ایک پروگرام میں انصار برنی صاحب (سوشل ایکٹیوسٹ) نے پاکستان کا یہ قانون اچھی طرح سمجھایا تھا کہ پاکستان کے قانون کے مطابق ماں باپ کی علیحدگی کی صوت میں تاوقتیکہ بچے کی عمر چھ سال نہ ہو جائے بچے نے ہر صورت میں ماں کے پاس ہی رہنا ہے اس کے بعد عدالت بچے سے بھی پوچھے گی اور باپ کے گھریلو حالات کا بھی جائزہ لے گی پھر اس کو کسٹڈی دینے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ جبکہ اس ڈرامے میں قانون اور اسلامی شرعی احکام کی دھجیاں اڑائی گئیں ہیں۔

کافی عرصہ قبل ایک ڈرامے میں لے پاک بچی کے متعلق بھی ایسا ہی دکھایا گیا کہ گود لینے والی ماں کا جب انتقال ہو گیا تو اہل محلہ ایک مولوی صاحب کی موجودگی میں اس بچی کو گود لینے والے باپ کے گھر سے نکالنے کے لئے جمع ہو گئے کہ وہ باپ اب نامحرم ہے۔ اس بارہ میں پیمرا کو نوٹس لینا چاہیئے کہ اس طرح کے ڈراموں میں غیر فطرتی کہانیاں اور جذبات کو انگیخت کرنے والے مناظر دکھا کر عوام کے ذہن آلودہ نہ کرے۔ یہ بات قابلِ غور ہے اور ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ

1:    ربیبہ کا سوتیلا والد ایک محرم رشتہ ہے اور باقی رشتے بھی محرم کہلائیں گے۔سوتیلے باپ کے گھر میں بچی اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتی ہے۔شریعت اور فقہ کے مطابق اس میں کوئی حرج نہیں۔

2:    لے پالک بچی جس کو اس کے غیر حقیقی ماں باپ نے اصل ماں باپ کا پیار دیا اور اپنے خون پسینہ کی کمائی اور محنت سے اسے پالا۔اور بچی اس گھر میں ہمیشہ رہتی رہی ہے۔گو شرعی لحاظ سے اس کے اصل باپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔لیکن اگر عدالتی اور قانونی لحاظ سے اگر باپ نے کسٹڈی لے رکھ ہے تو وہ باپ کا درجہ رکھتا ہے۔بظاہر عوام الناس کو ان کے ایک گھر میں رہنے سے متعلق مداخلت کا کوئی جواز نہیں۔نیز اگر لے پالک کی رضاعت ثابت ہو جائے تو پھر یہ بھی محرم رشتہ کہلائے گا۔

3:    اسی طرح رضائی رشتوں میں بھی محرم ہونے اور نامحرم ہونے کی بحث واضح طور پر شریعت نے بیان کی ہوئی ہے۔جس کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔اس بارہ میں دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کا فتوی نمبر 143802200023 ملاحظہ ہو۔

۱:    بیوہ عورت سے اگر رشتہ ازدواج کی قربت ہو چکی ہے تو اب اس بیوہ کی پہلے شوہر سے دونوں بیٹیاں اس شخص کے لیے محرم ہیں، البتہ فتنے میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو علیحدہ رہنا واجب ہے۔

۲: گود لی ہوئی بچی محض گود لینے سے محرم نہیں بنے گی، بلکہ غیر محرم ہی رہے گی اور اس سے پردہ واجب ہوگا، الا یہ کہ اس سے محرمیت کا کوئی اور رشتہ ہو، مثلاً رضاعت کا رشتہ ہو بایں طور کہ گود لینے والے کی بہن نے اسے دودھ پلا دیا ہو تو پھر وہ محرم ہوگی۔فقط واللہ اعلم

ربیبہ-اور-گود-لی-ہوئی-بچی-کا-محرم-اور-نامحرم-ہونا/

https//:www.banuri.edu.pk/readquestion/2016-11-04

بہر حال ہمارے ناول نگاروں اور ڈرامہ نگاروں و بے شک تاریخ، قانون اور عوامی معاملات کا گہرا علم اور اندازہ ہوتا ہے۔لیکن یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ڈرامہ نگاروں کو شرعی معاملات میں ایک بار متعلقہ علماء و ماہرین سے ضرور رابطہ کر لینا چاہیئے۔تاکہ وہ کسی بھی غیر شرعی اور غیر اسلامی اور تعلیم اور قانون کے برخلاف کوئی بات پیش کرنے والے ہوں۔بعض ڈرامہ نگاروں نے اس بات کو قلم کی آزادی سلب کرنے کے مترادف خیال کیا اور کہا کہ اس طرح مصنفین کو ڈکٹیٹ نہیں کیا جا سکتا ایسے ماحول میں ان کا ذہن آزادی کے ساتھ سوچ نہیں سکتا۔لیکن ان کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ بات اسلامی تعلیمات کے برخلاف ہے کہ آپ اپنی آزادی کے خیال میں اپنی اخلاقیات اور مذہبی حدود سے باہر نکل جائیں۔امید ہے یہ بات آپ کو سمجھ آ گئی ہوگی۔ ❁❁❁

نعت رسول مقبول ﷺ

ہَر دَم لَبّاں تے وَسدا، کَلمہ رَسُول دا
جِیون ہے میرا یَارو، صَدقہ رَسُول دا

ہُوندا جے خَاک طَیبہ، کیڈا کمال سی
چُم دَا کِسے وَسیلے، تلوہ رَسُول دا

آوَندِی اے بَاشنا فِر، میری زُبان چوَں
آوے جَدوں زُباں تے، نغمہ رَسُول دا

دُنیا حَیا جو کَردِی اے، بیٹیاں دَا آج
اِنساں وَاسطے ہے، تحُفہ رَسُول دا

کُجھ وِی نہ ہُور منگدَا، اَکرم خُدا توں میں
اِکّو ہے رِیجھ میری، جَلوہ رَسُول دا

شاعر: رانا محمد اکرم شاد

بھارت کو کس بات کا خوف ہے؟

تحریر: ضیاالرحمٰن ضیا

بھارت نے کشمیریوں کو کیوں قید کر رکھا ہے؟ بھارت کشمیری نوجوانوں کو کیوں قتل کر رہا ہے؟ بھارت کشمیریوں کی نسل کشی کے درپے کیوں ہے؟ بھارت کشمیریوں میں کیوں خوف و ہراس پھیلا رہا ہے؟ بھارت کشمیر میں لاکھوں کی تعداد میں موجود فوج میں کیوں اضافہ کر رہا ہے؟ بھارت کشمیری خواتین، بچوں اور بزرگوں کو کیوں تشدد کا نشانہ بنا رہا ہے؟ بھارت کو کس بات کا خوف ہے اور کس بات نے اسے کشمیریوں پر ہر طرح کا ظلم روا رکھنے پر آمادہ کر رکھا ہے؟ بھارت دنیا کو کشمیر تک رسائی کیوں نہیں دے رہا اور کشمیریوں کی چیخیں کیوں دبانا چاہ رہا ہے؟ تقریباً ان تمام سوالات کا جواب چند روز قبل کشمیری مجاہدین کی طرف سے بھارتی فوج پر ہونے والے حملے میں مل ہی گیا۔ اس میں بھارتی فوجی افسر سمیت پانچ فوجی جہنم واصل ہوئے۔ اس واقعے میں چار مجاہدین بھی شہید ہوئے۔ اس حملے نے بھارت کی چیخیں نکال دیں۔

امریکی کمیشن نے بھارت کو اقلیتوں کے لیے بدترین ملک قرار دیا ہے۔ (فوٹو: انٹرنیٹ)

یہ وہی ردعمل، بلکہ اس ردعمل کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا جو کشمیریوں پر ہونے والے مظالم کے جواب میں بھارت کو دیکھنا پڑے گا اور جس سے بھارت خوفزدہ ہو کر مزید غلطیاں کر رہا ہے اور وہ کشمیریوں میں غم و غصہ کی آگ کو مزید بھڑکا رہا ہے۔ اب وہ وقت دور نہیں جب بھارت کو کشمیریوں کی طرف سے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس بات سے بھارتی حکومت بھی بخوبی واقف ہے، کیونکہ انہوں نے کشمیریوں پر ظلم ہی اتنے کیے ہیں کہ وہ کسی بھی وقت بھارت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنی آزادی تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ بھارتی حکومت نے اسی ردعمل سے بچنے کے لیے کشمیریوں کو گھروں پر ہی محصور کر رکھا ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے دور کیا ہوا ہے تاکہ وہ منظم ہو کر جلسے جلوس نہ نکالیں اور بھارت کے لیے کوئی پریشانی نہ کھڑی کر سکیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کشمیری نوجوان انٹرنیٹ وغیرہ کا استعمال بھی خوب جانتے ہیں، اگر انہیں ایک دوسرے سے دور رکھا تو وہ انٹرنیٹ اور دیگر ذرائع استعمال کر کے ایک دوسرے سے رابطہ کریں گے اور اس طرح وہ ایک بھرپور تحریک چلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کے سامنے برہان وانی شہید اور ان کے ساتھیوں کی مثال موجود ہے جنہوں نے سوشل میڈیا کے ذریعے بھارتی فوج کی نیندیں حرام کر دی تھیں، جس کی پاداش میں بھارتی فوج نے انہیں شہید کر دیا تھا۔ اس لیے بھارت نے نوجوانوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے اور ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر رکھنے کے لیے انٹرنیٹ اور فون سروسز وغیرہ بند کر رکھی ہیں۔ بھارت کشمیریوں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بھارتی فوجی آئے روز مسلمانوں کے باپردہ گھروں پر چھاپے مارتے ہیں اور انہیں ہراساں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی گھروں کو منہدم کر دیتے ہیں اور کبھی جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ کبھی جعلی مقابلوں میں نوجوانوں کو شہید کر دیا جاتا ہے۔ پاک دامن بہنوں کی عزتیں لوٹی جاتی ہیں۔ یہ سب مظالم کشمیریوں میں غصے کا لاوہ بھر رہے ہیں جو عنقریب پھٹنے کو ہے۔ جس دن یہ لاوہ پھٹے گا اس دن بھارت کے لیے بہت سے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔ بھارتی فوجی کشمیر میں ٹھہر نہیں سکیں گے۔ اس لیے کہ فوج فوج کے ساتھ تو لڑ سکتی ہے لیکن عوام کے ساتھ نہیں۔ جب انسان دیکھتا ہے کہ اب اس کے لیے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تو پھر وہ اپنے دفاع کے لیے ایک بھرپور حملہ کرتا ہے کہ شاید اس طرح اس کی جان بچ جائے۔

شیخ سعدی، گلستان سعدی میں فرماتے ہیں: نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود؛ بر آرد بچنگال چشم پلنگ۔ یعنی کیا تونہیں دیکھتا کہ جب بلی عاجز آجاتی ہے تو پنجوں سے چیتے کی آنکھیں نکال لیتی ہے۔ چیتا بہت طاقتور ہوتا ہے، بلی اس کے ایک پاؤں کے برابر بھی نہیں۔ اس کے مقابلے میں بلی ایک بہت ہی کمزور جانور ہے۔ جب چیتا اس پر حملہ کرتا ہے تو بلی پہلے تو جان بچانے کے لیے بھاگتی ہے لیکن جب وہ دیکھتی ہے کہ اب کوئی اور راہ نجات باقی نہیں رہی تو وہ آخری حربے کے طور پر اپنے پنجوں سے چیتے پر حملہ کرکے اس کی آنکھیں نکال دیتی ہے۔ بھارت کا بھی یہی حال ہوگا کہ جب کشمیری ظلم سہتے سہتے تھک جائیں گے اور بھارتیوں کے ظلم وستم حد سے گزر جائیں گے تو پھر کشمیری عوام بھی آخری حربے کے طور پر طاقتور بھارتی فوج پر ٹوٹ پڑیں گے اور انہیں شدید نقصان پہنچا کر کشمیر چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کردیں گے۔ بس ایک بار انہیں موقع تو ملے پھر ان کا لاوہ پھٹنے میں دیر نہیں لگے گی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے جب ان کے پیاروں کو بے دردی سے شہید کیا جاتا ہے، ان پر تشدد کیا جاتا ہے اور عورتوں کی عزتوں پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے تو ان کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ جب اس طرح کی آگ کسی قوم میں بھڑکنے لگتے تو یہ اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک وہ ظالم کو کیفر کردار تک نہ پہنچادے۔ ایک بار کشمیر سے لاک ڈاؤن ختم ہوجائے تو کشمیری اس کا انتقام لیتے نظر آئیں گے۔ یہی خوف بھارت کو کھائے جارہا ہے جس کی وجہ سے وہ کشمیریوں کو رہا نہیں کررہا۔ دنیا کو بھی اس خوف سے وہاں تک رسائی نہیں دے رہا کہ وہاں پر بھارتی مظالم کا پردہ نہ چاک ہوجائے۔

امریکی کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی نے بھارت کو اقلیتوں کے لیے بدترین ملک قرار دیا ہے۔ اب پوری دنیا میں بھارت کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔ بھارتی حکومت کی طرف سے کشمیر میں لگائی گئی آگ پورے بھارت میں پھیل رہی ہے۔ پورا بھارت اس آگ میں جل رہا ہے۔ وہاں اقلیتیں غیر محفوظ ہیں، بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ نہایت غیر انسانی سلوک کیا جارہا ہے۔ کمیشن کی رپورٹ سیکولر بھارت کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ مودی بھارت کو ایسے اندھیروں میں دھکیل رہا ہے جہاں سے نکلنا ناممکن ہوجائے گا۔ اب بھارت کے سنجیدہ حلقے مل بیٹھ کر سوچیں اور مودی سے جان چھڑا کر بھارت کو تباہی سے بچالیں۔

❁❁❁

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پُر عزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاء اللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدردانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کردیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کررہے ہیں انکو متنبہ کیا جارہا ہے۔

اصل کی طرف گامزن: مکلی

تحریر: ضیاالرحمٰن ضیا

سندھ کی دھرتی وہ عظیم سرزمین ہے جہاں متعدد ثقافتی، تاریخی و قدرتی مقامات موجود ہیں، جو سیاحتی لحاظ سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ یونیسکو کی جانب سے مرتب کی جانے والی فہرست میں پاکستان کے چھ تاریخی مقامات عالمی ورثے میں شامل ہیں، جس میں سندھ سے دو مقامات کو یہ اعزاز حاصل ہے۔ ایک موہن جوداڑو اور دوسرا مکلی مانومینٹس۔ جبکہ محکمہ آثار قدیمہ سندھ جامع مسجد شاہجہان ٹھٹھہ، قلعہ رنی کوٹ جامشورو، بھنبھور، کوٹ ڈیجی خیرپور، جین مندر ننگر پارکر اور چوکنڈی قبرستان کراچی کو عالمی ورثے کی فہرست میں شامل کرانے کے لیے متحرک ہے۔

عالمی شہرت یافتہ مکلی ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر بار جانے پر ایک منفرد احساس واطمینان ملتا ہے۔ یہ وہ واحد قبرستان ہے جہاں جا کر قبرستان میں ہونے کا یقین نہیں آتا۔ ہم نہ جانے کتنی بار مکلی جا چکے ہیں اب تو یاد بھی نہیں، مگر یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ یہ تو ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ مقابر پر انتہائی نفیس انداز میں کندہ کی جانے والی قرآنی آیات اور خوبصورت نقش و نگاری دیکھنے والے کو حیران کر دیتی ہے۔ ہر بار ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے اور ہم اس کے حصار سے کئی دنوں تک نہیں نکل پاتے۔ الغرض ایک سحر ہے جو یہاں پر آنے والوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور دیکھنے والا صدیوں پرانی تاریخ میں کھو جاتا ہے۔ ہمارے قد سے اونچی قبریں اور بلند دیواروں والے مقبرے، جن پر کی جانے والے نقش و نگاری کا نفیس کام دیکھنے والے کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ سات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ مقبرے جاہ وجلال اور شان وشوکت سے کھڑے ہیں۔ یہاں پر چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک کے مقبرے اور قبریں موجود ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں دس لاکھ سے زائد مسلمان مدفن ہیں۔ مقابر کی تعمیر میں سندھی ٹائلوں اور سرخ اینٹوں کا استعمال ہوا ہے۔ قبروں کے تعویز اور ستونوں پر اتنا خوبصورت کام کیا گیا ہے کہ دیکھنے والا اس وقت کے عظیم کاریگروں کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مکلی ہمیشہ سے ہی عالمی محققین اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم مکلی گئے ہوں اور ہماری وہاں کسی غیر ملکی سیاح سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔

عالمی ورثہ ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی سیاح اور محققین مکلی کو اپنے زاویے سے دیکھتے ہیں اور مکلی ہمیشہ سے ہر عام وخاص کی نظر میں بھی رہتا ہے۔ 2016 میں جب ری ایکٹیو مانیٹرنگ مشن نے مکلی کے چوتھے دورے پر وارننگ دی تھی کہ اگر دی گئی تجاویز پر عمل نہیں کیا گیا تو مکلی کو ورلڈ ہیریٹیج سے خارج کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد اسٹیئرنگ کمیٹی کی میٹنگ محکمہ آثار قدیمہ اور نوادرات کے ڈائریکٹر جنرل منظور احمد کناسرو کی صدارت میں ہوئی تھی۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مشن کی دی ہوئی تجاویز پر مکمل عمل کیا جائے گا، پھر 2017 میں عملی طور پر اس پر کام شروع کیا گیا، جب کہ جون 2017 میں ہی کراکو پولینڈ میں یونیسکو کی جانب سے ہونے والی کانفرنس میں عبوری رپورٹ پیش کی گئی۔ اس میں صوبائی وزیر ثقافت، سیاحت اور نوادرات سید سردار علی شاہ اور ڈائریکٹر جنرل نوادرات منظور احمد کناسرو نے شرکت کی اور مکمل عمل درآمد کے لیے دو سال کا وقت مانگا اور اس کے بعد باقاعدگی سے کام کیا گیا، دی گئی تجاویز پر عمل کیا گیا اور 2019 میں باقو میں یونیسکو نے ورلڈ ہیریٹیج

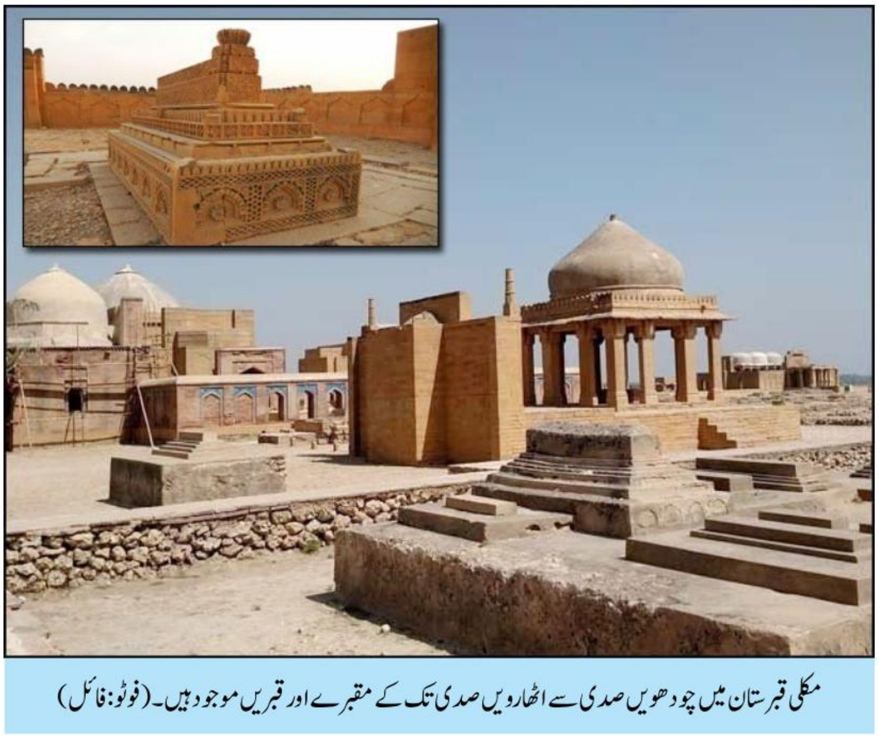

مکلی قبرستان میں چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک کے مقبرے اور قبریں موجود ہیں۔ (فوٹو: فائل)

کانفرنس کے تینتالیسویں سیشن میں مکلی کو ڈینجر لسٹ سے نکال کر دوبارہ بحال کر دیا۔ 2019 میں ہی جب ری ایکٹیو مانیٹرنگ مشن کی دو ممبر پر مشتمل ٹیم نے دوبارہ معائنہ کیا تو انہوں نے کیے جانے والوں کام پر اطمینان کا اظہار کیا۔

2017 سے اب تک بحالی و بچاؤ کے کام کی تفصیل بتاتے ہوئے مکلی کے آرکیالوجیکل کنزرویٹر سرفراز نواز جتوئی نے بتایا کہ 35 مقبروں اور یادگاروں پر کام کیا گیا، جن میں مرزا باقی بیگ، مرزا طغرل بیگ، عیسیٰ خان، دولہا دریا خان، ولی محمد، دیوان شرفا خان، میران بائی، لالی کا مقبرہ، غیرت خان، فردوس، جام جاٹی، قوث سلطانی، بارہ دری، مدرسہ اور تقریباً 21 کے قریب گمنام مقبرے اور قبریں جن پر محکمہ آثار قدیمہ نے بحالی اور مرمت کا کام کروایا ہے اور ان کی اصل حالت بحال کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ابھی دوسرے مقبروں کی جائزہ رپورٹ بنائی جا رہی ہے، جس میں علی محمد کا مقبرہ، آنسہ بائی کا مقبرہ اور دوسرے گمنام مقابر شامل ہیں۔

مکلی کے اس دورے پر ہم نے بڑے بڑے مقابر پر وقت گزارا۔ ہم نے دیکھا کہ مقبروں پر کی جانے والی جا بجا چاکنگ کا خاتمہ کیا جا چکا ہے جگہ جگہ بورڈز آویزاں کیے گئے ہیں، جن پر درست تاریخی معلومات کا اندراج کیا گیا ہے، جگہ جگہ ڈسٹ بن لگائے گئے ہیں، مقبروں کو جانچنے کے لیے کریکر مانیٹر یونٹ لگائے گئے ہیں۔ یونیسکو کی ہدایت کے مطابق موسمی اسٹیشن بھی قائم کیا گیا ہے تا کہ بارشوں، سورج کی تپش اور ہوا کے دباؤ کو مانیٹر کیا جا سکے اور سب سے بڑھ کر مکلی کا مکمل ماسٹر پلان ترتیب دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے جو قیمتی پتھر اور ٹائلز بکھرے پڑے ہوتے تھے ان کو اکٹھا کر کے خاص اسٹور میں جمع کر دیا گیا ہے۔ مکلی میں آمدورفت کی ایک بڑی وجہ یہاں کے 10 سے زائد مزارات ایسے ہیں جن پر میلے لگتے ہیں، جو قبرستان کے اندر گاڑیوں کی آمدورفت کی بڑی وجہ تھے اور اس آمدورفت سے نقصان کا بہت خدشہ تھا۔ اس وجہ سے عام گاڑیاں اندر لانے کی ممانعت ہے، جبکہ محکمہ نوادرات نے تین گاڑیوں پر مشتمل شٹل سروس شروع کی ہے جو 150 فی کس کے حساب سے پورے قبرستان کا دورہ کراتی ہے۔

تحقیق کے لیے آنے والوں کے لیے یہاں پر ایک گیسٹ ہاؤس بھی بنایا گیا ہے، جو بین الاقوامی محققین کے لیے فری ہے۔ حفاظتی انتظامات کی بات کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ مکلی کو قبضہ مافیا اور جانوروں سے بچانے کے لیے چاروں طرف سے دیوار بنائی جا رہی ہے، جو تقریباً 90 فیصد مکمل ہو چکی ہے اور دوسری طرف 24 گھنٹے مقبروں پر نظر رکھنے کے لیے چوکیداروں کو موٹر سائیکلیں دی گئی ہیں جو راؤنڈ دا کلاک گھومتے رہتے ہیں۔ سیاحوں کو معلومات دینے کے لیے بڑی ایس ایم ڈی لگائی جا رہی ہے۔ مقبروں کو رات کو روشن رکھنے کے لیے اسپاٹ لائٹس بھی لگائی جا رہی ہیں۔ 2017 میں انٹرنیشنل کانفرنس کرائی گئی۔ مکلی ویب سائٹ بنائی گئی اور گائیڈ بک بھی تیار کی گئی ہے۔ عبداللہ شاہ اصحابی سے جام نظام الدین سموں تک راستہ صاف کیا گیا ہے۔ تین سو سے زائد پودے اور درخت لگائے گئے ہیں۔ بہت جلد ٹھنڈے پانی کی ایس ایم ڈی مشین لگائی جائے گی اور سولر پلیٹیں بھی لگائی جائیں گی۔ محکمہ آثار قدیمہ و نوادرات کے ڈائریکٹر جنرل منظور احمد کناسرو کے مطابق مکلی میں نئی تدفین پر 144 قانون لگا کر بالکل بند کر دیا گیا ہے۔ مکلی کے نزدیک نیا قبرستان بنایا گیا ہے، اب مکلی کے قرب و جوار کے لوگ وہاں تدفین کر سکیں گے۔ قومی ورثے کو نقصان پہنچانے، بدصورتی پیدا کرنے، خطرے سے دوچار کرنے یا یہاں پر تعمیرات کرنے کے عمل پر سندھ کلچرل ہیریٹیج پریزرویشن ایکٹ 1994 کی دفعہ 18 کے تحت غیر قانونی اور قابل سزا عمل ہے جس پر ہر حال میں عمل کیا جائے گا۔ یہ قدیم ورثے ہماری تہذیب و ثقافت کی پہچان ہیں۔ ان کی حفاظت ہم سب پر فرض ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مکلی کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کی حفاظت وخیال اپنے گھر کی طرح رکھیں۔ کیونکہ مہذب اقوام اپنے تاریخی ورثے کو محفوظ رکھ کر ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھتی ہیں اور یہی قومی ورثے آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔

❁❁❁

یہاں ہر شخص ہر پل حادثہ ہونے سے ڈرتا ہے
کھلونا ہے جو مٹی کا ،فنا ہونے سے ڈرتا ہے

مرے دل کے کسی کونے میں اِک معصوم سا بچہ
بڑوں کی دیکھ کر دُنیا، بڑا ہونے سے ڈرتا ہے

عجب ہے زندگی کی قید میں دُنیا کا ہر انساں
رہائی مانگتا ہے اور، رہا ہونے سے ڈرتا ہے

اوریا مقبول جان نے آخر سچ اُگل دیا

تحریر: طارق احمد مرزا، آسٹریلیا

نیو ٹی وی نیٹ ورک پر 18 مئی 2020 کو نشر ہونے والے پروگرام ’حرفِ راز‘ میں جماعت احمدیہ کے دیرینہ مخالف اوریا مقبول جان صاحب نے اپنی زبان سے آخر وہ واحد سچ اگل ہی دیا جسے وہ روز اول سے اپنے پیٹ میں چھپائے پھرتے تھے۔ سچ اکثر کڑوا ہوتا ہے اور ہر آدمی کو ہضم نہیں ہوتا۔ اوریا مقبول جان صاحب بھی سچ کو ہضم نہ کر پائے۔ پروگرام، جس کی ریکارڈنگ یو ٹیوب پر دستیاب ہے، کے لگ بھگ 56 تا 59 منٹ میں انہوں نے فرمایا: ”چھوڑیں اسلام، اُس کو، پاکستان کا آئین کہتا ہے کہ قادیانی کافر ہیں“۔

اوریا مقبول جان صاحب کے اس ایک جملے نے بہت سی باتوں سے پردہ اٹھا دیا۔ اول طور پر یہ جملہ اوریا صاحب کی اپنی شکست کی اواز ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلامی اصول یعنی کہ شریعت کی رو سے وہ کسی ایسے شخص کو غیر مسلم یا کافر قرار نہیں دے سکتے جو شریعت کی بیان کی ہوئی مسلمان کی تعریف پر پورا اترتا ہو۔ دوسرا یہ کہ اوریا صاحب کا مبلغ اسلامی علم اتنا ہے کہ وہ قرآن وسنت کی بنیاد پر کسی بھی احمدی کے ساتھ براہ راست ڈائلاگ یا مناظرہ کرنے کی ہمت، طاقت یا جراءت نہیں رکھتے اور اسی لئے خود بھی اسلام کو چھوڑ کر قرآن وسنت سے رجوع کرنے کی بجائے محض آئین پاکستان کا حوالہ دینے میں عافیت سمجھی ہے اور اب دوسروں کو بھی یہی پیغام دے رہے ہیں کہ احمدیوں پر بات کرنی ہو تو اسلام کو چھوڑ کر محض آئین پاکستان کا حوالہ دیا کرو۔ یعنی اسلام کو نہیں چھوڑو گے تو لازماً احمدیوں کو مسلمان ماننا پڑے گا۔ ورنہ بتائیے آپ کے اس جملے کا مطلب کیا تھا؟۔ اوریا مقبول جان صاحب کیا بتا سکتے ہیں کہ معاذ اللہ کیا آئین پاکستان آئینِ اسلام اور دستورِ محمدی ﷺ سے بالا کوئی چیز ہے؟۔ اگر نہیں تو آپ کے اس بیان سے کیا یہ ثابت نہیں ہوتا کہ احمدیوں سے متعلق آئینی ترمیم اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اوریا صاحب احمدیت دشمنی میں اس قدر اندھے ہو چکے ہیں کہ انہیں اس قسم کے کفریہ کلمات بولنے میں کوئی باق محسوس نہیں ہوتا کہ احمدیوں کو کافر، غیر مسلم، مرتد، غیر ملکی، باغی وغیرہ قرار دینے کے لئے اسلام کو بھی چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دو اور صرف آئین پاکستان کی بات کرو۔ لیکن اوریا صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے آئین پاکستان کو بھی پوری طرح سے نہیں پڑھا ہوا۔ کیونکہ خود اسی آئین پاکستان کی ایک اور شق احمدیوں سے متعلق مذکورہ ترمیم کا ردّ کرتی ہے۔ وہ شق ہر پاکستانی کا مکمل مذہبی آزادی کا حق تسلیم کرتی ہے۔ ایسی آزادی جس میں ہر پاکستانی کو اپنے عقائد کے مطابق مذہبی شعائر اپنانے اور ان پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔ پروگرام میں اوریا مقبول جان صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص آئین پاکستان کو نہیں مانتا وہ پاکستان کا شہری نہیں ہے۔ یہ بالکل درست بات ہے لیکن اس بات کا زیر بحث موضوع سے کوئی بھی تعلق نہیں بنتا۔ انہوں نے محض سامعین کو مغالطہ دینے کی ایک غیر منطقی اور بھونڈی کوشش کی ہے۔ کیونکہ آئین کو نہ ماننے اور آئین کی کسی ایک ترمیم کو نہ ماننے میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ جیسا کہ اوریا صاحب بھی جانتے ہیں ہر نئی حکومت کسی نہ کسی ترمیم کو ختم یا تبدیل کرنے کی بات ضرور کرتی ہے یا کم از کم الیکشن سے قبل اس کا وعدہ یا سلوگن عوام کے سامنے رکھتی ہے۔ تو کیا آپ اسے بھی آئین شکنی قرار دے کر پوری حکومت یا پوری سیاسی جماعت کو پاکستان کا شہری تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں؟۔ موجودہ حکومت کے دور میں بھی کبھی آئین کے آرٹیکل 6 تو کبھی ترمیم نمبر 18 کو ختم یا تبدیل کرنے کی بحثیں چلی ہیں، بلکہ چل رہی ہیں۔ تو پھر آپ کا نزلہ احمدی پاکستانیوں پر ہی کیوں گرتا ہے؟ وہ بھی تو محض ایک عدد ترمیم کے حوالہ سے بات کرتے ہیں، نہ کہ پورے آئین کی۔ (احمدی تو آئین پاکستان میں شامل حب الوطنی، اور امانت دیانت صداقت کی شقوں پر سب سے نمایاں اور مثالی طور پر عمل کرنے والے ہیں)۔ کیا آئین پاکستان میں آئین پاکستان کی کسی ترمیم پر بات کرنے کی بھی ممانعت کی گئی ہے؟۔ یہ تو محض ترمیم کی بات ہے جو آپ سے ہضم نہیں ہوتی، جب حبیب جالبؔ لہک لہک کر پورے کے پورے آئین کو نہ ماننے کا اعلان کیا کرتے تھے تو آپ کیا، پوری قوم اس پہ سر دھنا کرتی۔ اور جب محترم شہباز شریف صاحب بھرے جلسے میں حبیب جالب کی یہی نظم (ایسے دستور کو، صبح بے نور کو، میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا) اپنی مترنم آواز میں جالبؔ کے انداز میں پڑھتے تو ان کے جیالوں سمیت نواز شریف صاحب بھی مظلوم شکل بنا کر سر ہلا ہلا کر داد دیتے۔ اس وقت کیوں آپ نے رگیں پھلا پھلا کر اور چیخ چیخ کر انہیں آئین پاکستان کا باغی اور غیر ملکی قرار نہیں دیا۔ قارئین کرام مذکورہ پروگرام میں اوریا مقبول جان صاحب نے احمدی پاکستانیوں سے متعلق اور بھی بہت سی ایسی باتیں کی ہیں جو سراسر خلاف واقعہ ہیں۔ لیکن ان سب کے جوابات بارہا دیئے بھی جا چکے ہیں اور بچے بچے کو بھی معلوم ہیں، اس لئے ان پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً یہ کہا کہ ربوہ میں احمدی آرام سے رہ رہے ہیں، پاکستان میں احمدی آزادی سے اپنا کاروبار کر رہے ہیں وغیرہ۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ربوہ (موجودہ چناب نگر) دنیا کا وہ واحد شہر ہے جس کی

پوری آبادی،.جی ہاں بچوں ، بوڑھوں ،مردوں عورتوں سمیت پوری آبادی پر ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔صرف اس لئے کہ وہ ایک دن ،.جی ہاں صرف ایک دن سب مل کر خوشیاں منانا چاہتے تھے!۔کاروبار کا جہاں تک تعلق ہے تو پاکستان کا کون سا وہ شہر ہے جس میں احمدی پاکستانی شہریوں کی دکانیں نہیں لوٹی گئیں؟۔کون سا ایسا بازار ہے جہاں ”قادیانیوں سے لین دین منع ہے“ اور ”شیطان، قادیان، شیزان سے دور رہیں“ وغیرہ کے پوسٹر، سٹکر نہیں لگے ہوئے۔آپ کس منہہ سے رمضان کے آخری عشرہ میں دن دہاڑے یہ جھوٹ بول رہے ہیں کہ پاکستان میں احمدی آزاد ہیں؟۔ان کی تو قبریں تک مسمار کی جاتی ہیں۔میّتوں کو قبروں سے نکال کر سڑک پر پھینک دیا جاتا ہے۔جس آئین کی آپ بات کر رہے ہیں کیا یہ سب حرکات اس نے جائز قرار دی ہوئی ہیں؟۔اوریا مقبول جان صاحب اپنے آن ریکارڈ بیان کے مطابق ”چھوڑ دو اسلام کو“ کی تلقین کر چکے، لہٰذہ ان سے اس قسم کی بحث تو کی نہیں جاسکتی کہ اسلام میں مسلمان کی کیا تعریف ہے، کافر کون ہے وغیرہ، احمدی کسے مسلمان سمجھتے ہیں وغیرہ۔ یہ ساری بحثیں منیر انکوائری رپورٹ اور پھر 74 کی اسمبلی کی کارروائی کی رپورٹ کی صورت میں نیز سینکڑوں کالموں، وڈیوز وغیرہ میں پہلے سے موجود ہیں۔اس لئے مناسب ہوگا کہ حبیب جالبؔ کی روح اور ان کے چاہنے والوں سے معذرت کے ساتھ ان کے کلام کو تھوڑی سی ”ترمیم“ کے ساتھ پیش کر کے تحریر کا اختتام کیا جائے۔:

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسی ”ترمیم“ کو، ”صبحِ دونیم“ کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

پھول شاخوں پہ کھلنے لگے، تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے، تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے تم کہو
اِس کھلے جھوٹ کو، ”دین میں“ لُوٹ کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

❁❁❁

کیمبرج کا تعلیم یافتہ ہبرٹ مائیکل کلوز 1937 میں انڈیا آیا, راجپوتانہ رائفل میں میجر کے عہدے تک پہنچا مگر بنیادی طور انکے اندر ایک استاد چھپا ہوا تھا, آرمی کو چھوڑا اور دہلی میں پڑھانا شروع کیا 1947 میں پشاور آیا اسلامیہ کالج اور ایڈورڈ کالج میں اپنے ہونہار شاگردوں کی تعلیمی ذوق کو بڑھانا اور اخلاقی لیول اونچا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

انکے شاگرد بڑے بڑے عہدوں تک پہنچے آج بھی اسے احترام سے یاد کرتے ہیں بوڑھا ہونے کے باوجود سائیکل پر گھومتا تھا پشاور یونیورسٹی کے ہر ڈیپارٹمنٹ کا چکر لگاتا تھا, 1965 کی جنگ میں سٹوڈنٹس بلڈ ڈونرز کو روزانہ سی ایم ایچ پشاور لے جاتا تھا زندگی بھر ہر دو ماہ بعد بلڈ ڈونیٹ کرتا تھا۔

کلوز صاحب پرائمری ٹیچرز کا بہت احترام کرتے تھے انکا کہنا تھا کہ پروفیسروں سے زیادہ اہم کام پرائمری ٹیچرز کرتے ہیں۔

لڑکے انہیں مذاق اور خوش مزاجی میں ”حاجی محمد کلوز“ کے نام سے پکارتے تھے وہ بھی اس سے خوش ہوتے تھے۔

پروفیسر کلوز اکثر افسوس کرتا تھا کہ انڈینز کی نسبت پٹھانز تعلیم میں بہت پیچھے ہیں, کراچی اور لاہور کے سول بیوروکریسی میں انکے دہلی والے شاگردوں کی اکثریت تھی ان میں سے جو پشاور میں تعینات ہوتے تھے یا پشاور والے شاگرد اعلیٰ افسران بنتے تھے اور ان سے ملاقات کیلئے ایڈورڈ کالج اور اسلامیہ کالج آتے تھے تو پروفیسر کلوز انہیں صوبہ سرحد میں تعلیمی خدمات کیلئے گزارش کرتے تھے۔

پروفیسر کلوز

A Pathan company(1994)

اور

Attlee, Wavell, Mountbatten and the transfer of power(1997)

جیسے مشہور تاریخی کتابوں کے مصنف تھے۔

اپنی زندگی کو پشتونوں کی تعلیم کیلئے وقف کرنیوالا یہ عظیم انسان اکتوبر 1999 کو پشاور میں وفات پا گیا۔

اللہ انکی روح پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔آمین۔

آپ نے یقیناً دیکھا ہوگا کہ بینک میں کام کرنے والے لوگ سردیوں گرمیوں میں ٹائیاں پہنے رہتے ہیں۔ یہ ان کا ڈریس کوڈ ہوتا ہے۔ یہ خوبصورت بھی ہیں، نکھرے نکھرے چہرے، صاف ستھرے کپڑے۔لیکن کبھی انہیں پانچ بجے کے بعد ملاحظ کیجئے جب بینک کے دروازے جنرل پبلک کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور شٹر نیچے گرا دیے جاتے ہیں۔اُس وقت بینک بند ہو جاتا ہے اور اکثر بینک والے کھل جاتے ہیں۔۔۔ٹائیوں والوں کی اکثریت ایک دم سے ٹائیاں اُتار پھینکتی ہے، شرٹ کا اوپر والا بٹن کھل جاتا ہے اور سارے ایک دم سے عام انسانوں والے حلئے میں آجاتے ہیں۔ یہ ہے اصل انسان۔ ہم سب سارا دن اپنے لباس سے لے کر چہرے تک ایک نقاب اوڑھے رکھتے ہیں لیکن جب یہ نقاب اترتا ہے تو بہت مزا آتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ماشاءاللہ انتہائی ڈیسنٹ اور صاف ستھری طبیعت کے مالک ہیں، اونچی آواز میں بولنا بھی تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں، لیکن گھر میں ہوں تو صبح کے وقت جب ماؤتھ واش استعمال کرتے ہیں تو اُن کے ازیت ناک غراروں کی آواز آس پاس کے سات گھروں تک جاتی ہے اور کئی لوگوں کا ناشتہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہ جو آپ کوئی لوگ کوٹ پینٹ ٹائی لگائے بڑے انگریز بن کر، چمچ اور کانٹے سے کھانا کھاتے نظر آتے ہیں، یہ گھر جاتے ہی دھوتی بلکہ لُنگی پہنتے ہیں اور آلتی پالتی مار کر بیگم کے سامنے زمین پر بیٹھ جاتے ہیں کہ ''شکیلہ! زرا تیل چس دے''۔۔۔ہم سب کا اندر بھی ایک ہے اور باہر بھی ایک۔ زندگی کے یہ دو روپ ہر انسان بڑی کامیابی سے نبھاتا ہے، لیکن اصل روپ وہی ہے جسے ہم سب سے چھپاتے ہیں۔۔ڈٹ کے کھانا ہم سب کو پسند ہے لیکن ڈائٹنگ فیشن کا حصہ ہے اسی لئے کچھ لوگ بے شک ڈیڑھ کلو کڑاہی کے ساتھ چھ نان کھا جائیں، کولڈ ڈرنک منگواتے وقت بیرے کو تاکید کرتے ہیں کہ ''ڈائٹ یا زیرو'' لانا۔ ہماری اکثریت میٹھا بھی پسند کرتی ہے لیکن فیشن کے لحاظ سے میٹھا سوٹ نہیں کرتا اس لیے جو لوگ چائے کے ساتھ جلیبیاں بھی کھا رہے ہوں وہ بھی احتیاطاً کہہ دیتے ہیں ''پلیز چینی نہ ڈالئے گا' میں پھیکی چائے پیتا ہوں''۔۔باہر کے انسان کو نبھانے کے لیے بھی کیا کیا جتن کرنا پڑتے ہیں، میرے ایک دوست کو کافی زہر لگتی ہے لیکن موصوف ظاہر یہ کراتے ہیں کہ انہیں بچپن میں گھٹی بھی کافی کی دی گئی تھی۔ ایک دفعہ ایک ہوٹل میں مدعو تھے جہاں ان کی کافی ساری خواتین کولیگز بھی موجود تھی۔ اللہ دے اور بندے لے۔ ویٹر نے سب کا آرڈر لیا تو فرمایا ''بھئی میرے لیے تو بلیک کافی لے آؤ''۔ میں ان کو کہنی ماری کہ ''حضور پہلے کبھی بلیک کافی پی ہے؟'' قہقہ لگا کر بولے ''بلیک کافی تو میری جان ہے''۔ دس منٹ بعد اُن کی جان کپ میں سامنے آ گئی۔ انہوں نے فخریہ انداز سے خواتین کی طرف دیکھا، کپ اٹھایا اور ایک سپ لیا۔۔۔ایک دم سے اُن کے چہرے کی رنگت تبدیل ہوگئی۔۔۔جسم اکڑ گیا۔۔۔بال کھڑے ہو گئے۔۔۔اور ڈیلے باہر آ گئے۔۔۔!!! باہر کے انسان کو بناوٹی گفتگوں کی بھی بیماری ہوتی ہے۔ اس کے سامنے پیزا اور دال چاول دکھ دیے جائیں تو یہ کھاتا تو پیزا ہے لیکن اندر کے سارے ووٹ دال چاول کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ یہ باہر چلی ساس کھاتا ہے لیکن گھر میں فرمائش ہوتی ہے کہ ہر کھانے کے ساتھ کچی ہری مرچ ضرور رکھی جائے۔۔۔یہ سٹور سے کاٹن خریدتا ضرور ہے لیکن کان خواتین کی بالوں والی پِن، ماچس کی تیلی یا گاڑی کی چابی سے ہی صاف کرتا ہے۔ اس کے باتھ روم میں ٹوتھ پیسٹ ضرور

موجود ہوتا ہے لیکن کہیں پیچھے کر کے منجن بھی رکھا ہوتا ہے۔ یہ ہاضمے کے لیے ہر کھانے کے بعد واک ضرور کرتا ہے لیکن سونے سے پہلے ''پھکی'' کھانا نہیں بھولتا۔ دُنیا والوں کے سامنے اِسے شیمپو پسند ہوتا ہے لیکن گھر میں ہو تو مشورے دے رہا ہوتا ہے ''شکیلہ! بیسن سے بال کتنے اچھے دُھلتے ہیں''۔ جواب میں فیشن ایبل شکیلہ بھی بڑے اعتماد سے بتا رہی ہوتی ہے ''ایک دفعہ لسی سے بھی دھو کر دیکھو''۔۔۔یہ اندر کا کھرا انسان بڑا سادہ ہوتا ہے، یہ باہر والے انسان سے بالکل اُلٹ ہوتا ہے۔ یہ لاکھ فیشن ایبل ہو جائے پھر بھی اسے باتھ ٹب سے زیادہ بالٹی میں نہانے کا مزا آتا ہے۔ یہ دُنیا داری نبھانے کے لیے پینٹ تو پہنتا ہے لیکن جس دن شلوار قمیص پہن لے اُس دن عجیب سی شخصی آزادی سے سرشار رہتا ہے۔ بظاہر اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ سونے سے پہلے بھی شیو کرتا ہوگا، بال سنوارتا ہوگا۔لیکن جس دن اسے چھٹی ہوتی ہے یہ الجھے بالوں کے ساتھ گال کھجاتا ریلیکس Feel کر رہا ہوتا ہے۔۔۔یہ باہر کا انسان جو گھر سے نکلتے وقت اپنے کپڑوں پر ایک شکن برداشت نہیں کرتا، گھر میں رات کو سوتے وقت بیوی سے لڑ رہا ہوتا ہے کہ ''میری پھٹی پرانی شرٹ کیوں دھلوائی ہے، اُس میں مجھے اچھی نیند آتی ہے''۔ فیشن ہماری نیت کو نہیں بھر سکتا، ہم کسی چائینز ریسٹورنٹ میں ''پران'' کھا تو سکتے ہیں، پسند نہیں کر سکتے۔ بلیک فارسٹ کیک ہمارے باہر کے انسان کو پسند آ سکتا ہے لیکن اندر کا انسان خطائی اور کریم والے بسکٹ مانگتا ہے۔ ہم بڑی کوشش کرتے ہیں کہ اندر کا انسان ''سلائڈز'' کہنا سیکھ جائے لیکن اندر والا ''گھیسیاں'' کہنے پر ہی خوش ہوتا ہے۔ ہم دُنیا کے سامنے ہوں تو زرا سی چوٹ لگنے پر ''آؤچ'' کہتے ہیں لیکن اکیلے ہوں تو بے ساختہ منہ سے یہی نکلتا ہے ''ہائے میں مر گیا''۔ باہر کا انسان کہتا ہے کوئی اچھی چیز دیکھ کر ''واؤ'' کہو۔۔۔اندر کا انسان کہتا ہے ''اتھے رکھ'' زیادہ بہتر ہے۔۔۔بیڑے غرق ہو گئے ہیں اس باہر کے انسان کی فرمائشیں پوری کرتے کرتے۔ ہر وقت یہی خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں لوگ مذاق نہ بنا لیں۔ حالانکہ سب ایک جیسے ہیں، سب وہی چاہتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس رمز کو پالیا ہے انہوں نے بڑے طریقے سے فیشن کے اندر ہی روایت کے لیے بھی جگہ بنا لی ہے، یاد کیجئے چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھانا جاہلیت کی علامت سمجھا جاتا تھا، آج کل ٹی وی کے اشتہاروں میں خوشنما لوگ نہ صرف چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھاتے نظر آتے ہیں بلکہ بچوں کو بھی سکھا رہے ہوتے ہیں کہ یوں کر کے بسکٹ ڈبونا ہے اور پھر یوں کر کے منہ میں ڈالنا ہے۔ ''لچھے'' اب کاٹن کینڈی کے نام سے دستیاب ہیں اور ساری چیزوں کو ''آرگینک فوڈ'' کا نام دے کر اپنا لیا گیا ہے۔ ہائے لیکن میرے جیسے تاریک راہوں میں مارے گئے ہیں۔۔ہم پھونک پھونک کر ایلیٹ کلاس میں قدم رکھتے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ کوئی پہچان نہ لے کہ ہم نے پینٹ کی فٹنگ ٹھیک کروائی ہے، دُنیا ہم پر ہنسے گی۔۔اب تو آئینہ بھی ہمیں ہمارا اصل نہیں دکھاتا۔

شعبہ پاکستان

9 سو سال قدیم التت کا شاہی قلعہ

تحریر: ہدایت حسین

تاریخی قلعے کے ذکر سے قدیم زمانے کی بودوباش اور رہن سہن کے مناظر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ پاکستان کے مختلف خطوں میں متعدد تاریخی اہمیت کے قلعے موجود ہیں، جو ماضی کی شاندار داستانیں سناتے ہیں۔ ان ہی میں ایک وادیٔ ہنزہ، کریم آباد میں واقع التت کا 900 سال پرانا قلعہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ 14 ویں اور 15 ویں صدی کے دوران شمالی پاکستان میں کئی چھوٹی اور خودمختار ریاستیں موجود تھیں، جن میں وادیٔ ہنزہ اور وادیٔ نگر کی ریاستیں روایتی طور پر ایک دوسرے کی مخالف تھیں۔ یہ دونوں ریاستیں دریائے ہنزہ پر آمنے سامنے واقع تھیں۔

قدیم زمانے کے لداخ اور تبّتی طرزِ تعمیر کا ایک شاہ کار، برف پوش پہاڑوں اور بلند وبالا چوٹیوں کے درمیان وادیٔ ہنزہ میں ایک بڑی چٹان کے اوپر بنا عظیم الشان التت کا شاہی قلعہ تاریخی اور دفاعی اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یہ قلعہ مختلف درجوں میں تعمیر کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر کے لیے بلتستان سے ماہرین بلوائے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں لداخ اور تبّت کا فنِ تعمیر نمایاں نظر آتا ہے۔ التت قلعہ پاکستان کے شمال میں گلگت بلتستان کے دارالحکومت، گلگت سے تقریباً 100 کلومیٹر کے فاصلے پر ضلع ہنزہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں التت میں واقع ہے، جسے ریاست ہنزہ کے بادشاہ نے شاہی محل کے طور پر تعمیر کروایا تھا، لیکن بعد میں دفاعی طور پر استعمال کرنا شروع کردیا۔ بلاشبہ، التت قلعہ، گلگت بلتستان کی تاریخ کا ایک اہم شاہ کار ہے۔ جس کی تعمیر میں لکڑی اور پتھر کا استعمال مہارت سے کیا گیا ہے۔ اس کے چھوٹے دروازے اور اندر موجود پتھر کے قدیم تبّتی، کشمیری، روسی اور چینی برتن اُس دور کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ 8.5 ریکٹر اسکیل تک کے زلزلے کو برداشت کرنے والا یہ قلعہ اُس زمانے کے ماہرینِ فنِ تعمیر کی خوبیوں کا واضح عکّاس بھی ہے۔ قلعے کے داخلی دروازے کے ساتھ پُرانے طرز کے استقبالیہ کمرے میں ایک مئے خانہ بھی موجود ہے۔ کمرے ہی سے متصل ایک عمودی قبر بھی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس دور میں شاہی خاندان کے ایک باغی شہزادے کو اس کے بڑے بھائی نے بغاوت کے جرم میں قلعے کے ایک ستون میں زندہ چُنوا دیا تھا۔ اور پھر 2009ء میں قلعے کے تزئین و آرایش کے دوران اس عمودی قبر کے اندر باغی شہزادے کی باقیات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ قلعے میں ایک جیل بھی موجود ہے، جہاں باغی قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ قدیم شاہی کانفرنس روم میں وقت کے حکمران اور وزراء میٹنگز کرتے تھے۔ بادشاہ اور ملکہ کے لیے الگ الگ لِونگ رومز بھی موجود ہیں۔ جنگی حالات میں شہزادوں، شہزادیوں اور خاندان کے افراد کو پناہ دینے اور سرد موسم کی سختی سے بچانے کے لیے قلعے میں ایک خصوصی حفاظتی کمرا بھی تعمیر کیا گیا تھا۔

تاریخی روایات سے پتا چلتا ہے کہ 14 ویں صدی سے 1974ء تک گلگت بلتستان میں کئی ایک چھوٹی بڑی خودمختار ریاستوں نے حکومت کی، ان میں وادیٔ ہنزہ اور وادیٔ نگر کی ریاستیں خصوصی اہمیت کی حامل تھیں۔ یہ دونوں ریاستیں آمنے سامنے واقع ہیں اور قدیم دَور میں روایتی طور پر ایک دوسرے کی مخالف ہوا کرتی تھیں۔ ان ریاستوں کے حکمرانوں کو تھامو یا میر کے نام سے جانا جاتا تھا،

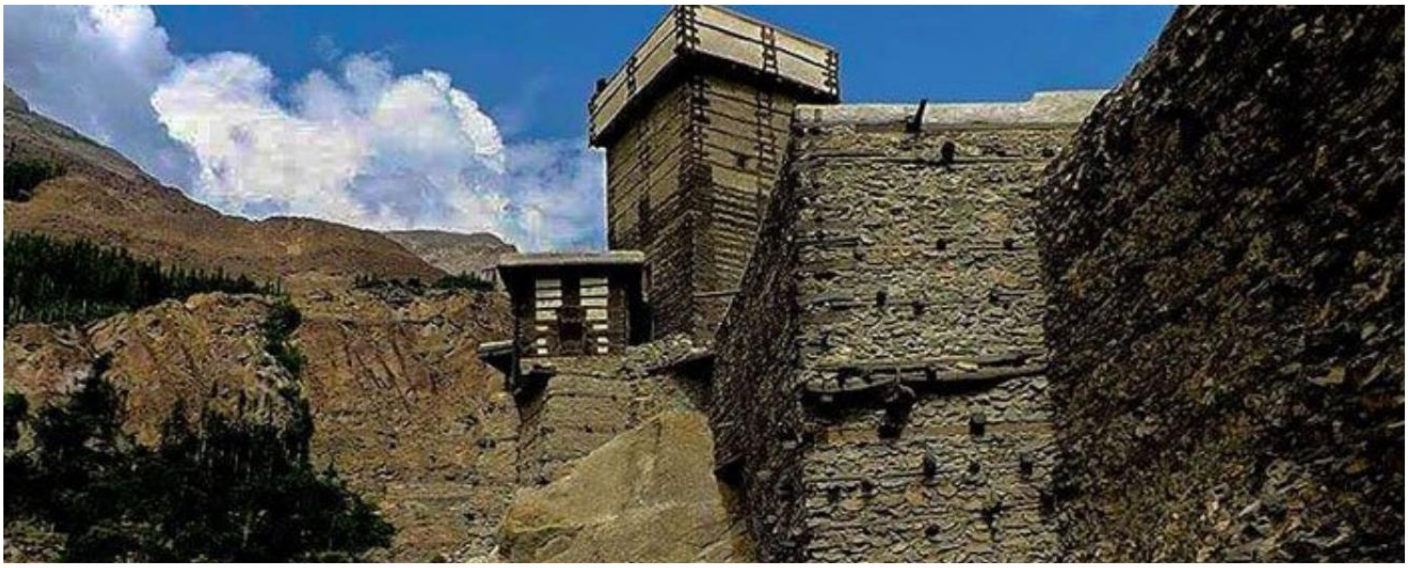

جن کے درمیان آپس میں کئی جنگیں بھی ہوئیں۔ التت کا قلعہ جس علاقے میں واقع ہے، وہاں سے قدیم شاہ راہ ریشم سے کبھی تاجروں کے قافلے گزرا کرتے تھے۔قدیم سلک رُوٹ کا گیٹ وے کہلانے والے ہنزہ اورنگر کی دفاعی اہمیت کے پیشِ نظر مہاراجہ کشمیر، روس اور دیگر عالمی قوتوں نے اس علاقے پر قابض ہونے کی غرض سے کئی حملے کیے۔ دفاعی حکمتِ عملی کے پیشِ نظر قلعے میں ایک واچ ٹاور بھی نصب کیا گیا، جس کا مقصدان جنگوں اور دشمن کی پیش قدمی کو روکنا اور علاقے کی نگرانی کرنا تھا۔ تاہم، اب یہ واچ ٹاور سیاحوں کو پُرکشش پہاڑی چوٹیوں کی سرزمین وادئ نگر میں موجود راکاپوشی، دیران اور گولڈن پیک کے ساتھ ساتھ وادی کے پُرفضا مقامات کے حسین نظاروں سے لُطف اندوز کرواتا ہے۔ 400 سو سال قبل قلعے کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی، جہاں حکمران عبادت کیا کرتے تھے، جب کہ قلعے سے ملحق پھانسی گھاٹ میں باغیوں اور سزائے موت کے قیدیوں کو پھانسی دے کر پہاڑ سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا۔ 1891ء میں انگریزوں نے علاقے پر قبضے کے بعد قلعے کی مزید توسیع کی۔ بعدازاں، وقت کے بے رحم تھپیڑوں، حالات کے دھاروں اور سماجی و سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے قلعے کی رونق ماند پڑنے لگی، تو مقامی انتظامیہ نے 2006ء میں آغا خان فاؤنڈیشن کے تعاون سے اس قدیم قلعے کی تعمیرِ نو کے کام کا آغاز کیا۔اور پھر تین سال کی مدّت میں قلعے کی تزئین وآرایش کا کام مکمل ہونے کے بعد 2009ء میں سیّاحوں اور عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا۔ ❁❁❁

پنجاب کے دل لاہور سے " پرتاب" نام کا ایک اخبار نکلا کرتا تھا جو کہ پرتاب نام کے ایک ہندو کا تھا وہی اس کا مالک بھی تھا اور چیف ایڈیٹر بھی۔ایک دن پرتاب نے سرخی لگا دی:"مسلمان سارے کافر ہیں!" لاہور میں تہلکہ مچ گیا، پرتاب کے دفتر کے باہر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا جو مرنے مارنے پر تیار تھا، نقصِ امن کے خطرے کے پیش نظر انگریز کمشنر نے پولیس طلب کر لی، مجمعے کو یقین دلایا گیا کہ انصاف ہوگا اور مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے گی، تمام مکاتب فکر کی مشترکہ کمیٹی کے پچاس آدمیوں کی مدعیت میں پرچا کٹوا دیا گیا۔ چالان پیش کیا گیا اور مجسٹریٹ نے جو کہ انگریز ہی تھا، پرتاب سے پوچھا یہ اخبار آپ کا ہے؟ جی میرا ہے!اس میں جو یہ خبر چھپی ہے کہ مسلمان سارے کافر ہیں اپ کے علم اور اجازت سے چھپی ہے؟ جی بالکل میں ہی اس اخبار کا مالک اور چیف ایڈیٹر ہوں تو میرے علم واجازت کے بغیر کیسے چھپ سکتی ہے! آپ اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہیں؟

جی جب یہ جرم ہے ہی نہیں تو میں اس کا اعتراف کیسے کرسکتا ہوں، مجھے تو خود مسلمانوں نے ہی بتایا ہے جو میں نے چھاپ دیا ہے! صبح ہوتی ہے تو یہ لوگ سپیکر کھول کر شروع ہوتے ہیں کہ سامنے والی مسجد واالے کافر ہیں، وہ ظہر کے بعد شروع ہوتے ہیں تو عشاء تک ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ فلاں مسجد والے کافر ہیں اور اتنی قطعی دلیلیں دیتے ہیں کہ میں تو قائل ہوگیا کہ یہ واقعی کافر ہیں اور مجھے یقین ہے کہ عدالت بھی یقین کرنے پر مجبور ہوجائے گی بس اگلی تاریخ پر فلاں فلاں محلے کے فلاں فلاں مولوی صاحبان کو بھی بلا لیا جائے اور جن 50 آدمیوں کی مدعیت میں پرچا کاٹا گیا ھے انہیں بھی اگلی پیشی پہ بلا لیا جائے تو معاملہ ایک ھی تاریخ میں حل ہوجائے گا! اگلی پیشی پر تمام متعلقہ مولویوں کو جو کہ صبح شام دوسرے فرقے کے لوگوں کو مدلل طور پر کافر قرار دیتے تھے اور پرتاب نے جن کا نام دیا تھا، باری باری کٹہرے میں طلب کیا گیا۔ مجمعے میں سے تمام افراد کو کہا گیا کہ دیوبندی، اہل حدیث اور بریلوی وغیرہ الگ الگ کھڑے ہوں! بریلوی مولوی سے قرآن ہر حلف لیا گیا، جس کے بعد پرتاب کے وکیل نے اس سے پوچھا کہ دیوبندوں اور اھل حدیثوں کے بارے میں وہ قرآن وسنت کی روشنی میں کیا کہے گا؟

مولوی نے کہا کہ یہ دونوں توہینِ رسالت کے مرتکب اور بدترین کافر ہیں! پھر اس نے دیوبندیوں اور اہلِ حدیثوں کے بزرگوں کے اقوال کا حوالہ دیا اور چند احادیث اور آیات سے ان کو کافر ثابت کر کے فارغ ہوگیا، جج نے پرتاب کے وکیل کے کہنے پر اہل حدیثوں اور دیوبندیوں سے کہا کہ وہ باہر تشریف لے جائیں! اس کے بعد دیوبندی اور اہلِ حدیث مولویوں کو یکے بعد دیگرے حلف لے کر گواہی کے لئے کہا گیا، دونوں نے بریلویوں کو مشرک ثابت کیا اور پھر شرک کے بارے میں قرآنی آیات اور احادیث کا حوالہ دیا! گواہی کے بعد مجسٹریٹ نے بریلویوں کو بھی عدالت سے باھر بھیج دیا! اس کے بعد پرتاب کے وکیل نے کہا کہ مجسٹریٹ صاحب اپ نے خود سن لیا کہ یہ سب ایک دوسرے کو کافر سمجھتے اور ببانگ دھل کہتے بھی ھیں اور کافر ہو کر عدالت سے نکل بھی گئے ہیں اب عدالت میں جو لوگ بچتے ہیں ان میں سے مدعیوں کے وکیل صاحب بھی ان تینوں فرقوں میں سے کسی ایک فرقے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں،، لہذا یہ بھی کافروں میں سے ہی ہیں! باقی جو مسلمان بچا ہے اسے طلب کر لیجئے تا کہ کیس آگے چلے! مجسٹریٹ نے کیس خارج کر دیا اور.......... پرتاب کو بری کر دیا نیز پرتاب اخبار کو دوبارہ بحال کر دیا!!

یہ دھندا تقسیم ہند کے ستر سال بعد بھی جاری وساری ہے۔

بجواب صابر شاکر صاحب

تحریر: جمیل احمد بٹ

جناب صابر شاکر صاحب۔ ۱۴ مئی کے اپنے پروگرام میں آپ نے یہ بُھلا کر کہ قرآن کریم نے جھوٹ کو نجاست کہا ہے احمدیوں کے بارے میں جتنی باتیں کیں وہ سب سراسر من گھڑت اور جھوٹ تھیں۔ جماعت احمدیہ کے حوالے سے پاکستان چیپٹر اور لندن ہیڈ کوارٹر کی اصطلاحات گھڑ کر ان کے الگ الگ موقف ظاہر کرنا تو ایسا جھوٹ ہے جس کا اصل جواب صرف ایک آیت قرآنی (آل عمران: ۶۲) کا آخری حصہ ہے۔ کاش آپ جانتے کہ جماعت احمدیہ اور اس کے خلیفہ کا باہم رشتہ جسم اور روح جیسا ہے۔ جس طرح روح کے بغیر جسم لاشہ ہے اسی طرح خلیفہ کے بغیر جماعت۔ خلیفہ ہر احمدی کے دل کی دھڑکن ہے اور ہم اسے دیکھ کر ہی جیتے ہیں۔ اس کا وجود ہم پر ایک گھنے سایہ کی طرح ہے جس کے تلے ہم ہر تلخی کو بھول کر خوش و خرم رہ رہے ہیں۔ ہمارے چہروں کی مسکراہٹ اس کے مسکراتے چہرہ کی رہین ہے۔ ہم اپنا ہر دکھ سکھ اس سے شیئر کرتے ہیں اور اس کی رہنمائی میں اپنی زندگیوں کے بڑے بڑے فیصلہ کرتے ہیں۔ دنیا کے دو سو سے زائد ملکوں میں آباد مختلف قوموں، رنگوں اور زبانوں والے احمدی اس کے یکساں مطیع اور فرمانبردار ہیں اور یکساں اس کی محبت کے اسیر۔ مختصر یہ کہ

؎ لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں غالب
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

اور آپ کا یہ کہنا کہ پاکستان کے احمدی کسی کمیٹی کی رکنیت کے لئے خود کو غیر مسلم کہنے کو تیار ہیں محض سفید جھوٹ اور خام خیالی ہے۔ احمدی جو کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان کے ساتھ اللہ اور رسول ﷺ کی محبت میں سرشار ہیں۔ قرآن کو اپنی شریعت مانتے ہیں۔ اسے پڑھتے، یاد کرتے اور اس پر عمل کرتے ہیں ہرگز آں حضور ﷺ کا دامن چھوڑ نہیں سکتے۔ ان کو یہی تعلیم ہے۔ اور یہی نمونہ ان کے لئے مثال ہے کہ حضرت بانیؑ جماعت نے خود پر ہونے والے سارے انعاماتِ الٰہیہ کو اپنے آقا آں حضور ﷺ کا فیض قرار دیا اور یہی اعلان فرمایا کہ

؎ وہ ہے میں چیز کیا ہوں
بس فیصلہ یہی ہے

اور آپ کا یہ کہنا کہ پاکستان کے احمدی سسٹم کا حصہ بننے کے لئے تیار ہیں ایک اور بڑا جھوٹ اور خوش فہمی ہے۔ آپ کا یہ سسٹم ہے کیا؟ بیشتر بے علم، بد اخلاق، کرپٹ، ایک دوسرے کو کافر کافر کہتے، مسالک۔ زبانوں اور علاقہ کی بنیا پر ٹکڑے ٹکڑے اور باہم دست و گریبان افراد کی ایک بھیڑ اور ان پر ویسے ہی اکثر بدکردار اور کرپٹ افراد پر مشتمل حکومت، عدلیہ اور انتظامیہ۔ اور ان سب پر مسلط مذہب کا کاروبار کرنے والے اور خود کو علمائے دین کہلوانے والے افراد کا وہ ٹولہ جن کو آں حضرت ﷺ نے بدترین مخلوق اور سؤر اور بندر فرمایا اور جس کی حرکتوں سے ہر روز ان پیشگوئیوں کی تصدیق ہوتی ہے۔

کوئی احمدی با قائمی ہوش و حواس اپنی جنّت کو چھوڑ کر اس سسٹم کا حصہ کیوں بنے گا؟ پھر ایسا کرنے کی وجہ آپ کے بقول یہ ہے کہ انہیں پاکستان میں تمام حقوق حاصل ہیں اور مذہبی آزادی ملی ہوئی ہے۔ یہ دونوں سخت مضحکہ خیز جھوٹ ہیں۔ مذہبی آزادی کا یہ حال ہے کہ پاکستان کے قوانین کے مطابق احمدیوں کے لئے اپنے عقیدہ کا اظہار بھی جرم ہے۔ وہ اذان نہیں دے سکتے۔ مسجد کو مسجد اور نماز کو نماز نہیں کہہ سکتے۔ سلام نہیں کر سکتے۔ اللہ کے ذکر میں انشااللہ، الحمدللہ، ماشااللہ نہیں کہہ سکتے۔ عید پر قربانی نہیں کر سکتے۔ ان کی تمام مذہبی کتب بحق سرکار ضبط ہیں اور یہ کتب وہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ حتیٰ کہ اپنی شریعت کی کتاب قرآن کریم اپنے پاس نہیں رکھ سکتے ہیں۔ اگر وہ ان میں سے کوئی 'جرم' کریں تو تین سال قید کے سزا وار ہوتے ہیں۔ پھر آخر وہ کون سی مذہبی آزادی ہے جو آپ کی دانست میں احمدیوں کو پاکستان میں حاصل ہے؟

رہ گئے شہری حقوق تو ان کو حال بھی سِوا ہے۔ پاکستان میں احمدیوں کو ووٹ کا حق نہیں۔ سول اور فوجی ملازمتوں کے راستے ان پر بند ہیں۔ انتظامیہ اور عدالتیں ان کے خلاف جانبدار ہیں۔ ان کا پریس مکمل طور پر بند ہے۔ وہ کوئی اخبار، رسالہ اور کتاب شائع نہیں کر پا رہے۔ میڈیا پر ان کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے یک طرفہ پروپا گنڈا عام ہے۔ آپ کی اپنی مثال سامنے ہے۔ جو جس کے منہ میں آئے وہ اس اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ پیمرا اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیں گے۔ ان کے قومیائے گئے تعلیمی ادارے کئی دہائیوں پہلے ادائیگی کے باوجود لوٹائے نہیں گئے۔ ربوہ جس کی پچانوے فی صد آبادی احمدی ہے اس کا شہر کے انتظام میں کوئی حصہ نہیں ہے اور شہر کی سڑکیں اور دیگر نظام مسلسل عدم توجہی کا شکار ہیں۔ اپنے اس شہر میں انہیں اپنے اجتماعات اور سالانہ جلسہ کرنے کی اجازت نہیں۔ غرضیکہ احمدیوں سے پاکستان میں گزشتہ ۵۴ سال سے تیسرے درجے کے شہریوں کا سا سلوک ہو رہا ہے۔ اس پر آپ کا یہ دعویٰ کہ انہیں حقوق اور مذہبی آزادی حاصل ہے زخموں پر نمک چھڑکنا نہیں تو اور کیا ہے؟

صابر شاکر صاحب یہ بے سروپا جھوٹ بولنے سے سستی شہرت اور بہتر ریٹنگ کے آپ کے طلوب دنیوی فائدے تو شاید آپ کو حاصل ہو جائیں۔ لیکن یاد رہے کہ کل آپ اس سب کے لئے جواب دہ ہوں گے اور اللہ کی عدالت پاکستان کی عدالتوں جیسی نہیں ہوگی۔

پیالی میں طوفان

آج ایک دوست نے ایک چینل کے پروگرام کی کلپ بھجوائی۔ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ کس طرح دین کی حمایت کے نام پر اس کی تعلیمات کی نافرمانی کرتے ہوئے پیالی میں طوفان اٹھانے کی لاحاصل کوشش کی گئی ہے۔غصّہ کی آگ میں بھڑکے ہوئے اینکر پرسن، اپنی گردن آزاد کرانے کی کوشش میں ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دو وفاقی وزرا اور موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے بے چین مخالف سیاسی پارٹی کے رکن، سب نے پچیس منٹ خوب جھوٹ، غیبت، بہتان طرازی، تجسس اور گالم گلوچ کا بازار گرم کئے رکھا۔ اور چلتے چلتے ایک نعت خواں کو بھی اس تماشہ میں گھسیٹ لیا۔ دوسری ترمیم کو نہ ماننے کا قضیہ بھی خوب ہے۔ اس سے کس کو انکار ہے کہ یہ ترمیم آئین کا حصہ ہے۔ نہ ماننے کا الزام اصل میں یہ جتانا ہے کہ جب بے گناہ ہونے کے باوجود سیاسی مقاصد کے لئے، طاقت اور زور کے بل پر، آئین اور قانون کی اغراض کے لئے دار پر لٹکا ہی دیا ہے تو پھر اب یہ بے گناہ اپنے آپ کو مجرم کیوں نہیں مان لیتے۔ جب سزا یافتہ یہ نہیں مانتے اور سردار بھی اپنی بے گناہی پر اصرار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نکالا جاتا ہے کہ وہ آئین کے غدار ہیں۔ آج آئین کی اٹھارویں ترمیم زیرِنظر ہے۔ دونوں طرف کی سیاسی بازی گر اس کے حسن و قبح کو موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ یہ سب لوگ اس ترمیم کو موجودہ شکل میں نہیں مانتے۔ لیکن اس سے پاکستان اور اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا اور نہ کوئی یہ کہتا ہے کہ ایسا کر کے یہ لوگ آئین کا انکار کر رہے ہیں اور ملک کے غدار ہیں۔ پھر دوسری ترمیم پر تحفظات کا اظہار کیوں جرم ہے؟

ملک کے شہریوں کی ایک جماعت کی مذہبی حیثیت کے بارے میں یہ بلا جواز اور بلا استحقاق قانون سازی ملا کے فتاویٔ کفر سے اگر مختلف ہے بھی تو یہ فرق حقیقت میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ پروگرام میں آیت خاتم النبیین بھی پڑھی گئی۔ نہ جانے کتنے شرکا یہ جانتے تھے کہ یہ عظیم آیتِ کریمہ اٹھارہ سن نبوی میں نازل ہوئی۔ اس کے نزول کے بعد بھی قبول اسلام کے لئے کبھی ختم نبوت کا اقرار شرط نہیں رہا۔ بس ہمیشہ اتنا اظہار ہی کافی سمجھا جاتا رہا کہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ بلکہ آج بھی ساری اسلامی دنیا میں کسی شخص کے مسلمان ہونے یا رہنے کے لئے ختم نبوت کا اقرار نہیں کرایا جاتا۔ اور سوائے وطن عزیز کے سب نے اسی طریق کو برقرار رکھا ہے جو آں حضرت ﷺ نے جاری فرمایا تھا۔ اس پروگرام میں شرکا کا دلیل کے بغیر احمدیوں کے خلاف گالم گلوچ اس بات کا ایک بار پھر اعتراف ہے کہ سن ۷۴ کی ترمیم اور اس پر سن ۸۴ کے آمرانہ قوانین اور سن ۲۰۱۰ کی خوں ریزی کے ردے سب احمدی کی استقامت کے آگے سرنگوں رہے ہیں اور ۴۵ سال بعد بھی حق ہمیشہ کی طرح سربلند ہے اور رہے گا۔

(جمیل احمد بٹ ۱۱ مئی ۲۰۲۰)

غیر مسلم ماننے کا مطالبہ؟

انسانی حقوق کی بحالی کے لئے احمدیوں سے پہلے اپنے آپ کو غیر مسلم مان لینے کا مطالبہ آج کل میڈیا پر دہرایا جا رہا ہے۔ اس مطالبہ کو ماننے کی عملی صورت کیا ہے؟

اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والے غیر مسلم ہیں۔ ان سب کے اپنے اپنے عقائد، عبادات اور رسوم ہیں۔ تاہم ان میں ایک قدرِ مشترک ہے کہ یہ سب اسلام کو بطور مذہب اپنے لئے قابل قبول نہیں سمجھتے۔ قرآن کو خدا کی کتاب اور آں حضرت ﷺ کو سچا نبی نہیں مانتے۔ کوئی شخص اسلام چھوڑ کر ان میں سے کسی مذہب کو اختیار کرتا ہے تو وہ اسلام، اس کی کتاب اور اس کے نبی کو رد کر کے ہی یہ قدم اٹھاتا ہے۔ پس احمدیوں سے اپنے آپ کو غیر مسلم ماننے کا مطالبہ اصل میں یہ ہے کہ وہ اسلام کو رد کر دیں۔ قرآن کو خدا کی کتاب نہ مانیں۔ اور آں حضرت کی صداقت کا انکار کرتے ہوئے ان سے اپنا ناطہ توڑ لیں۔ ان مطالبہ کرنے والوں کی محبت رسول ﷺ کیسے اس بات کو گوارا کرتی ہے کہ وہ لاکھوں افراد کی ایک جڑی ہوئی جماعت سے خود کو دامن رسول ﷺ سے کاٹ لینے کا مطالبہ کریں۔ یہ تو وہی جانتے ہوں گے۔ جہاں تک احمدی کا تعلق ہے اس کو تو گھٹی میں اللہ سے تعلق، آں حضرت ﷺ سے محبت اور قرآن سے عشق کا درس دیا جاتا ہے۔ اس کا بچپن پابندیٔ نماز، تلاوت قرآن کریم اور پیارے رسول کی پیاری باتیں سنتے گزرتا ہے۔ دلوں میں بسی ان محبتوں کو حضرت بانیٔ جماعت کی تعلیم کو پڑھ اور سن کر جلا دیتے وہ بچے سے بڑا ہوتا ہے۔ اور پھر انہی کی خاطر اپنی ساری زندگی دین کے لئے اپنا وقت اور مال قربان کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ محبتیں پانچ نسلوں سے اس کا سرمایہ حیات ہیں وہ یہ سب کیسے چھوڑ سکتا ہے؟

جو لوگ یہ تعجب کرتے ہیں کہ احمدی کیوں اپنے آپ کو غیر مسلم مان نہیں لیتے۔ وہ اس محبت کی گہرائی، وسعت اور طاقت سے ناواقف ہیں جو ایک احمدی اپنے دل میں اللہ، اس کے رسول ﷺ اور اس کی کتاب کے لئے رکھتا ہے۔ وہ اپنی جان کو بھی اس کے آگے ہیچ جانتا ہے۔ سینکڑوں احمدیوں نے اسی محبت کی خاطر اپنی جانیں نچھاور کر دیں لیکن اس تعلق کو نہ چھوڑا۔ پس احمدیوں سے یہ مطالبہ ایک ناممکن امر کا مطالبہ ہے۔ وہ حضرت بانی سلسلہ کی تعلیم کے مطابق اللہ سے تعلق کی راہ میں جدوجہد کرتے رہیں گے۔ آں حضرت ﷺ سے محبت کے اس چراغ کو اپنے سینوں میں یونہی روشن رکھیں گے۔ اور قرآن کریم ان کی کتاب شریعت رہے گی۔ آخر وہ گزشتہ پانچ دہائیوں سے حکومتوں اور قانون کی سرپرستی میں تیسرے درجہ کا شہری بن کر، تمام انسانی حقوق چھنوا کر، ووٹ کے حق سے محروم رہ کر، ہر میدان میں ناانصافی اور حق تلفیوں سہہ کر، میڈیا پر یک طرفہ پراپاگنڈا اور ہر خاص و عام کی گالیاں سن کر اور معاشرے میں تحقیر کا نشانہ بن کر جی ہی رہے ہیں۔ اگر یہ انہیں رسول اللہ ﷺ کے دامن سے چمٹے رہنے کی سزا ہے۔ تو پھر یہ سب انہیں قبول ہے۔ ہاں احمدیوں کو اپنے آپ کو غیر مسلم مان لینے کا مشورہ دینے والے یہ ضرور یاد رکھیں کہ ظلم اور ناانصافی کا دور کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو بالآخر اس تاریکی کو مٹنا ہوتا ہے کہ گہری سے گہری تاریک رات کی زندگی بھی بس سورج کی پہلی کرن تک ہی ہوتی ہے۔ (جمیل احمد بٹ۔ ۱۵ مئی ۲۰۲۰)

شعبہ انٹرنیشنل

1857 کی جنگِ آزادی؛ جب دلی نے موت کو رقصاں دیکھا

تحریر: ریحان فضل

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے، میں وہ ایک مشت غبار ہوں

آج کے دور میں ایک عام آدمی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ ان اشعار کے خالق آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے 1857 میں انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی آزادی کی پہلی جنگ میں ہندوستانیوں کی قیادت کی ہوگی۔

11 مئی 1857 کو پیر تھا اور رمضان کی 16 تاریخ۔ صبح سات بجے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر ندی کنارے لال قلعے کے تصویر خانے میں اشراق کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی وقت انھیں جمنا پار ٹول ہاؤس سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔

انھوں نے اس کی وجہ جاننے کے لیے فوراً اپنا ہرکارہ وہاں بھیجا اور وزیر اعظم حکیم احسان اللہ خان اور قلعے کی حفاظت کے ذمہ دار کیپٹن ڈگلس کو بھی طلب کر لیا۔ ہرکارے نے آکر بتایا کہ انگریزی فوج کی وردی میں ملبوس کچھ ہندوستانی سواروں نے برہنہ تلواروں کے ساتھ دریائے جمنا کا پل عبور کیا تھا اور انھوں نے دریا کے مشرقی کنارے پر واقع ٹول ہاؤس کو لوٹنے کے بعد آگ لگا دی تھی۔ یہ سن کر بادشاہ نے شہر اور قلعے کے تمام دروازے بند کرنے کا حکم دے دیا۔ شام چار بجے ان باغیوں کے رہنما نے بادشاہ کو پیغام بھجوایا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ باغی دیوان خاص کے احاطے میں جمع ہو گئے اور اپنی بندوقوں اور پستولوں سے ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔

'باغی بادشاہ کی آشیرباد کے خواہشمند تھے'

دلی میں اس زمانے کے بڑے رئیس عبداللطیف نے 11 مئی کے اپنے روزنامچے میں لکھا: 'بادشاہ کی مثال وہی تھی جو شطرنج کی بساط پر شہ دیے جانے کے بعد بادشاہ کی ہوتی ہے۔' بہت دیر چپ رہنے کے بعد بہادر شاہ ظفر نے کہا کہ 'میرے جیسے بزرگ آدمی کی اتنی بے عزتی کیوں کی جا رہی ہے، اس شور کی وجہ کیا ہے؟ ہماری زندگی کا سورج پہلے ہی اپنی شام تک پہنچ چکا ہے۔ یہ ہماری زندگی کے آخری دن ہیں۔ اس وقت ہم صرف تنہائی چاہتے ہیں۔' بعد میں چارلس میٹکاف نے اپنی کتاب 'ٹوئیشنز نیریٹو' میں لکھا: 'حکیم احسان اللہ خان نے سپاہیوں سے کہا آپ انگریزوں کے لیے کام کرتے رہے ہیں اور مقررہ تنخواہ کے عادی ہیں۔ بادشاہ کے پاس کوئی خزانہ نہیں ہے۔ وہ کہاں سے آپ کو تنخواہ دیں گے؟'

'سپاہیوں نے جواب دیا کہ ہم سارے ملک کا پیسہ آپ کے خزانے میں لے آئیں گے۔ بہادر شاہ ظفر نے کہا کہ میرے پاس نہ تو فوجی ہے، نہ ہتھیار اور نہ ہی پیسہ، تو انھوں نے کہا ہمیں صرف آپ کی حمایت چاہیے۔ ہم آپ کے لیے سب کچھ لے آئیں گے۔' چارلس لکھتے ہیں 'بہادر شاہ ظفر تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ فوری فیصلہ نہ کر پانا ان کی شخصیت کا سب سے بڑا نقص تھا لیکن اس دن بہادر شاہ ظفر نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی اور ہاں کر دی۔' وہ ایک کرسی پر بیٹھے اور سبھی سپاہیوں نے باری باری ان کے سامنے آکر سر جھکایا اور انھوں نے ان کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا۔ سپاہیوں نے قلعے کے کمروں پر قبضہ کر لیا اور کچھ نے تو دیوان عام میں اپنے بستر لگا دیے۔'

چاندی کا تخت اور نئے سکے

بادشاہ نہ تو اتنے بڑے لشکر کو قابو میں رکھ سکتے تھے اور نہ ہی ان کا انتظام کر سکتے تھے لہٰذا وہ خود لشکر کے قابو میں آ گئے۔ اگلے دن بادشاہ نے اپنا شاہی لباس زیبِ تن کیا۔ چاندی کے تخت پر رونق افروز ہوئے۔ بادشاہ کے نام پر سکے جاری کیے گئے پھر پھر ایک بڑی توپ داغے جانے کی آواز سنائی دی۔

انگریزوں کے خلاف بغاوت کیسے اور کیوں شروع ہوئی

اس سب کی شروعات 10 مئی 1857 کو میرٹھ میں اس وقت ہوئی تھی جب

بنگال لانسر کے سپاہیوں نے بغاوت کر کے دلی کی جانب کوچ کیا تھا۔ 1857 کے واقعات پر انتہائی اہم تحقیق کرنے والی معروف تاریخ دان رعنا صفوی بتاتی ہیں: 'ایسی بندوقیں آئی تھیں جس کے کارتوسوں کو منہ سے کاٹ کر بندوق میں بھرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں یہ کہا جارہا تھا کہ اس کے اندر گائے کی اور خنزیر کی چربی ہے لہٰذا جو مسلمان تھے وہ بھی ان کو چھونے سے کترا رہے تھے اور ہندو بھی ان کو چھونے سے کترا رہے تھے۔' رعنا صفوی کے مطابق 'اس کے علاوہ بھی اسباب تھے کہ انھیں سمندر پار لڑائی کے لیے بھیجا جارہا ہے۔ تو برہمنوں کا یہ عقیدہ ہے کہ پانی یعنی سمندر پار کرلیا تو ان کی ذات ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی ترقی بھی صرف ایک حد تک ہوتی تھی۔ ہندوستانی سپاہی صوبے دار سے آگے نہیں جا سکتے تھے۔ اس طرح کی ان کی بہت ساری شکایتیں تھیں۔' کچھ لوگوں نے اسے غدر کہا تو کچھ نے جنگ آزادی کا نام دیا۔

دلی والوں نے باغیوں کا خیر مقدم نہیں کیا

ابتدا میں دلی والوں نے ہاتھ پھیلا کر ان باغیوں کا خیر مقدم نہیں کیا بلکہ کچھ حلقوں یہاں تک کہ بہادر شاہ کے قریبی لوگوں نے بھی ان کی مخالفت کی تھی۔ کہا گیا کہ ان باغیوں نے بھی شہنشاہ کا احترام نہیں کیا اور اس معاملے میں دربار کے قوانین کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا۔ درباریوں کو اعتراض تھا کہ وہ دربار میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے نہیں اتارتے اور شہنشاہ کے سامنے ہتھیار لے کر جاتے تھے۔ مشہور تاریخ دان اور کتاب 'بسیج 1857: وائسز آف دہلی' کے مصنف محبوب فاروقی بتاتے ہیں کہ 'دلی والے ناراض تھے لیکن اس سے ہم ایسا کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ دلی والے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑنا نہیں چاہتے تھے۔' بات یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف لڑائی ہر آدمی اپنے حساب سے لڑنا چاہے گا۔ کوئی یہ نہیں چاہے گا کہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں آپ کے گھر کے اوپر 40 سپاہی آکر بیٹھ جائیں۔' 'جب ہم آزادی کی لڑائی مہاتما گاندھی یا کانگریس پارٹی کے ساتھ لڑ رہے تھے، بھگت سنگھ کے ساتھ لڑ رہے تھے تو بھی ہندوستان میں ہزاروں لاکھوں ایسے لوگ تھے جو یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے گھر پر کوئی آنچ آئے یا پولیس ان کے گھر پر آجائے۔ یہی بات 1857 پر بھی صادق آتی ہے۔'

انتشار کے باوجود انتظام برقرار تھا

کہا جاتا ہے کہ ان واقعات نے دلی والوں کی زندگی میں بہت ہی اتھل پتھل مچادی لیکن محبوب فاروقی کا خیال ہے کہ تمام تر انتشار کے باوجود نظام پہلے ہی کی طرح قائم تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ '1857 کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بہت افرا تفری تھی، بہت بدنظمی تھی، کوئی تنظیم نہیں تھی، کوئی کنٹرول نہیں تھا، کوئی ڈھانچہ نہیں تھا لیکن میں اپنی کتاب میں یہ بات کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔' ظاہر سی بات ہے کہ ڈیڑھ لاکھ شہریوں کے درمیان اگر 70 یا 80 ہزار فوجی آ جائیں گے تو کچھ نہ کچھ افراتفری تو پھیلے گی۔ اگر آج دلی کی جتنی آبادی ہے اس میں 30 لاکھ فوجی آکر بیٹھ جائیں تو شہر کا کیا حال ہوگا۔' ان کے مطابق 'اس کے باوجود جو بہت ہی حیرت انگیز اور عجیب وغریب چیز ہے کہ اگر کمانڈر ان چیف کوتوال سے کہہ رہا ہے کہ چار سپاہی جو ڈیوٹی پر نہیں گئے تھے ان کو پکڑ لاؤ اور چار سپاہی پکڑ لیے جاتے ہیں اور وہ آ جاتے ہیں اور معافی مانگتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ یہ اچھا نظم وضبط ہے۔'' آپ کو محاذ پر چار سو چارپائیاں چاہییں اور وہ آپ کو مل رہی ہیں تو یہ فراہمی کا ایک طریقہ ہے۔ یہ آسمان سے تو نہیں اتر رہیں، کسی نے کہا، کوئی گیا، کوئی لے کر آیا اور فوراً ہی اس کا پیسہ دیا گیا۔ یہ تو ایک مثال ہے کہ لڑائی صرف سپاہی نہیں لڑتے ہیں۔ لڑائی جب آپ لڑتے ہیں تو آج کے زمانے میں بھی اگر آپ کو ٹاٹ کی بوریاں چاہییں، آپ کو پانی چاہیے، قلی چاہیے، مزدور چاہیے تو وہ سب ایک سپاہی کے ساتھ چار مزدور ہوتے ہیں تو وہ سب کہاں سے آ رہے تھے؟

56 برطانوی مارے گئے

12 مئی کی صبح دلی انگریزوں سے پوری طرح خالی ہو چکی تھی لیکن چند انگریز خواتین نے قلعے کے باورچی خانے کے پاس کچھ کمروں میں پناہ لے رکھی تھی۔ باغیوں نے بادشاہ کی مخالفت کے باوجود ان سب کو قتل کر دیا۔ رعنا صفوی کہتی ہیں '11 اور 12 کو جب انھوں نے حملہ کیا اور انگریزوں پر وار کیا تو اس وقت کافی انگریز تو شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور کافیوں کو انھوں نے مارا بھی۔ کچھ عورتوں نے قلعے میں آکر پناہ لی۔ وہیں پر انھوں نے دشمنی میں 56 لوگوں کو مار ڈالا۔ ان میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے جبکہ ان میں ایک دو مرد بھی تھے۔' ان کے مطابق 'بہادر شاہ ظفر کے خلاف جب مقدمہ چلا تو ان کے خلاف سب سے بڑا الزام یہی تھا کہ انھیں آپ نے مروایا۔ حالانکہ ظہیر دہلوی کی کتاب اگر پڑھیے تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت 1857 کے غدر کے وقت قلعے میں موجود عینی شاہدین تھے وہ بتاتے ہیں کہ بادشاہ نے بہت کہا تھا کہ یہ کسی بھی مذہب میں نہیں لکھا ہے کہ تم معصوموں کو مارو۔'

انگریزوں کی واپسی اور سزائیں

کچھ دنوں کے بعد ہی بغاوت کرنے والوں کے قدم اکھڑنے لگے اور دلی سے بھاگ نکلنے والے انگریزوں نے واپسی کی۔ انبالہ سے آنے والے فوجیوں نے بازی پلٹ دی اور انگریز ایک بار پھر دلی میں داخل ہو گئے۔ اور پھر شروع ہوا سزاؤں کا سلسلہ۔ اس وقت کے ایک برطانوی سپاہی، 19 سالہ ایڈورڈ وائبرڈ نے اپنے چچا گورڈن کو ایک خط میں لکھا تھا 'میں نے اس سے پہلے بھیانک مناظر دیکھے ہیں، لیکن کل میں نے جو کچھ دیکھا ہے، میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میں پھر کبھی ایسا منظر نہیں دیکھوں۔' 'خواتین کو چھوڑ دیا گیا، لیکن اپنے شوہروں اور بیٹوں کی موت کے بعد، ان کی چیخیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ مجھے ان پر ترس نہیں آیا لیکن جب میری آنکھوں کے سامنے معمر افراد کو جمع کر کے مار دیا گیا تو یہ میں مجھ پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔'

محبوب فاروقی کہتے ہیں 1857 میں بہر حال افراتفری تھی اور کیوں نہ ہو کہ آپ اس بڑے پیمانے پر ایک ورلڈ پاور اور سپر پاور کے ساتھ لڑائی کر رہے ہیں تو ہم یہ امید نہیں کر سکتے کہ شہر میں جو کچھ جیسا تھا چلتا رہے گا۔ ظاہری بات ہے شہر میں شدید دہشت کا ماحول تھا، شک کا ماحول تھا، لڑائی چل رہی تھی تو اس قسم کا ماحول تو ہو گا۔ تاہم ان کے مطابق 1857 کی بغاوت کے بعد جس طرح سے شہر اور شہریوں کو جبر کا نشانہ بنایا گیا اور جو انگریزوں نے کیا اس کی بھی مثال نہیں ملتی۔ دلی کے تمام شہریوں کو چھ مہینے تک شہر کے باہر رکھا گیا اور دلی والوں نے چھ مہینے تک سردی اور برسات میں کھلے آسمان تلے گزارے جبکہ محلوں کے محلے لوٹ لیے گئے۔ ان کا کہنا ہے کہ مرزا غالب بھی اسی دلی میں تھے۔ دیکھیں کہ وہ اس سب سے کتنے دہشت زدہ ہوئے کہ انھوں نے 1857 کے بعد سے اپنی زندگی کے باقی 12 برسوں میں کل 11 غزلیں کہی ہیں۔ یعنی ایک سال کی ایک غزل بھی نہیں بنتی ہے۔ تو شاعر مرزا غالب اور فنکار مرزا غالب یا جو وہ پوری کھیپ تھی 1857 کے بعد ختم ہو گئی۔ 1857 کے بعد سے ہندوستانی کبھی اس اعتماد کے ساتھ نہ انگریزوں سے مل پائے نہ بات کر پائے جو اس سے قبل ان میں موجود تھی۔ 1857 کی لڑائی ہندوستانی کی آخری لڑائی تھی جو وہ اپنی شرائط پر لڑ رہے تھے۔ اس کا مطلب اپنے ہتھیاروں پر نہیں بلکہ اپنی ذہنی شرائط پر اپنی نفسیاتی شرائط پر۔

بادشاہ نے ہتھیار ڈال دیے

انگریز دلی میں داخل ہوئے تو بہادر شاہ ظفر لال قلعے کے عقب سے اپنی پالکی میں بیٹھ کر پہلے حضرت نظام الدین کے مزار پر گئے اور پھر وہاں سے ہمایوں کے مقبرے پر جہاں پر 18 ستمبر 1857 کو کیپٹن ولیم ہاجسن نے انھیں گرفتار کیا۔ بعد میں سی پی ساونڈرس کو تحریر کردہ خط میں انھوں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا: 'بادشاہ، مرزا الٰہی بخش اور مولوی کے ساتھ ایک پالکی پر باہر آئے۔ ان کے پیچھے بیگم اپنے بیٹے مرزا جوان بخت اور والد مرزا قلی خان کے ساتھ باہر نکلیں۔ پھر پالکیاں رک گئیں اور بادشاہ نے پیغام بھجوایا کہ وہ میرے منہ سے سننا چاہتے ہیں کہ ان کی جان بخش دی جائے گی۔ میں اپنے گھوڑے سے اترا اور میں نے بادشاہ اور ان کی بیگم کو یقین دلایا کہ ہم آپ کی زندگی کی ضمانت دیتے ہیں بشرطیکہ آپ کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کی جائے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ ان کی بے عزتی نہیں کی جائے گی اور ان کے وقار کو برقرار رکھا جائے گا۔ بہادر شاہ ظفر کی جان تو بخش دی گئی لیکن ان کے تین بیٹوں خضر سلطان، مرزا مغل اور ابو بکر کو ہتھیار ڈالنے کے باوجود گولی مار دی گئی۔ ولیم ہڈسن نے اپنی بہن کو ایک خط میں لکھا میں فطرتاً بے رحم نہیں ہوں لیکن مجھے ان تین بدبختوں سے چھٹکارا پا کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔'

جب بادشاہ قیدی بنا

بادشاہ کو لال قلعے کی ایک کوٹھڑی میں ایک معمولی قیدی کی طرح رکھا گیا۔ سر جارج کیمبل اپنی کتاب ''میموائرز آف مائی انڈین کریئر'' میں لکھتے ہیں کہ بادشاہ کو ایسے رکھا گیا جیسے کسی جانور کو پنجرے میں رکھتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی نگرانی کے لیے تعینات لیفٹیننٹ چارلس گریفتھ نے اپنی کتاب ''سیج آف دہلی'' میں لکھا: ایک عام سی چارپائی پر مغل بادشاہ کا آخری نمائندہ بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی لمبی سفید داڑھی تھی جو ان کے پیٹ تک آ رہی تھی۔ انھوں نے سفید رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اسی رنگ کا صافہ باندھ رکھا تھا۔ ان کے پیچھے دو اردلی کھڑے ہوئے تھے جو مور کے پنکھ سے بنے پنکھے سے ان پر پنکھا جھل رہے تھے۔ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا ان کی آنکھیں زمین پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔ ان کے مطابق بادشاہ سے تین فٹ دور ایک دوسری چارپائی پر ایک برطانوی افسر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے دونوں طرف سنگینیں لیے انگریز سنتری کھڑے تھے جنھیں حکم تھا کہ اگر بادشاہ کو بچانے کی کوشش کی جائے تو وہ فوراً اسے مار ڈالیں۔

بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی اس حد تک بے عزتی کی گئی کہ انگریزوں کے گروہ کے گروہ انھیں دیکھنے آتے تھے کہ مغل بادشاہ دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں۔ محمود فاروقی

کہتے ہیں: بہادر شاہ ظفر کو قید کرنے کے بعد سے لال قلعے کی ایک کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا جہاں انگریز سیاح آ کر جس طرح آپ لال قلعے کو آج دیکھنے جاتے ہیں اسی طرح وہ ان کی کوٹھڑی میں جا کر انھیں دیکھتے تھے کہ یہ ہیں بہادر شاہ ظفر۔ جس آدمی کا جس بادشاہ ہندوستان کا دلی میں ہی یہ حال تھا تو ظاہر سی بات ہے کہ انھوں نے اپنی موت کی حسرت میں ہی باقی سال گزارے۔ یہاں سے انھیں رنگون بھیجا گیا اور اسی کے آس پاس رنگون کے بادشاہ کو مہاراشٹر لایا گیا۔

یہ انگریزوں کی دنیا بھر میں حکومت تھی کہ بادشاہوں کی تجارت ادھر سے اُدھر ہو رہی تھی۔ بہادر شاہ کے آخری ایام افسوس ناک اور دردناک ہیں۔ یہی وہ صورتحال تھی جس میں انھوں نے کہا:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ان پر جو کچھ گزرنا تھی میرا خیال ہے کہ 57 کے دوران اور اس کے بعد ان پر گزر چکی تھی۔ اس سے بُرا کیا ہوگا کہ تیموریہ جانشین اور بادشاہ ہندوستان کو آپ نے ایک کوٹھڑی میں رکھا ہوا ہے اور انگریز عورتیں اور بچے آ رہے ہیں ان کو دیکھنے کے لیے کہ اچھا یہ تھا بہادر شاہ!

بادشاہ کی موت

سات نومبر 1862 کو رنگون کے ایک جیل نما گھر میں کچھ برطانوی فوجی ایک 87 سالہ شخص کی لاش کو احاطے میں کھودی گئی قبر میں دفنانے کے لیے لے کر چلے۔ جنازے میں مرنے والے کے دو بیٹے اور ایک مولوی شامل تھے۔ کسی خاتون کو جنازے میں شرکت کی اجازت نہ تھی۔ بازار میں کچھ لوگوں کو اس کی بھنک پڑی تو انھوں نے جنازے میں شامل ہونے کی کوشش کی لیکن مسلح سپاہیوں نے انھیں قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ دفنانے سے قبل فوجیوں نے قبر میں چونا ڈال دیا تاکہ لاش جلد از جلد گل کر مٹی میں مل جائے۔ ایک ہفتے بعد برطانوی کمشنر ایچ این ڈیویز نے لندن بھیجی گئی رپورٹ میں لکھا اس کے بعد میں بقیہ شاہی قیدیوں کی خبر لینے ان کی رہائش گاہ پر گیا۔ سب ٹھیک ٹھاک ہیں اور کسی پر اس بوڑھے کی موت کا اثر دکھائی نہیں دیا۔ ان کی موت گلے میں فالج کی وجہ سے ہوئی۔ تدفین کی صبح پانچ بجے ان کا انتقال ہوا۔ ان کی قبر کے چاروں طرف بانس کی باڑ لگائی جا چکی ہے۔ جب تک یہ باڑ ختم ہوگی تب تک وہاں گھاس اس زمین کو ڈھانپ چکی ہوگی اور کسی کو علم نہیں ہوگا کہ مغلوں کا آخری بادشاہ یہاں دفن ہے۔ (بشکریہ بی بی سی اُردو)

گیارہ امریکی صدور کے لیے کھانے بنانے والا باورچی کورونا سے ہلاک

ویب ڈیسک

سابق امریکی صدر ڈیوائٹ ڈی آئزن ہاور سے لے کر جان ایف کینیڈی، رچرڈ نکسن، جمی کارٹر، رونالڈ ریگن، جارج بش، بل کلنٹن اور براک اوباما سمیت 11 صدور کے لیے لذیذ اور پرتعیش کھانے تیار کرنے سمیت ان کی دوسری خدمات کرنے والے باورچی ولسن روز ویلٹ جرمنی کورونا میں مبتلا ہونے کے بعد ہلاک ہوگئے۔ ولسن روز ویلٹ جرمن نے امریکی صدارتی ہاؤس "وائٹ ہاؤس" میں مجموعی طور پر 60 سال سے زائد عرصے تک خدمات سرانجام دیں اور یہ عرصہ وہاں پر ملازمت کرنے کا سب سے طویل عرصہ ہے۔ ولسن روز ویلٹ جرمن کو وائٹ ہاؤس میں 1957 میں کلینر کی ملازمت ملی تھی اور وہ کئی سال تک وہاں صفائی کا کام کرتے رہے تھے۔ انہوں نے ملازمت کا آغاز امریکا کے 34 ویں صدر ڈیوائٹ ڈی آئزن ہاور کے دوسرے دور میں کیا تھا تاہم امریکا کے 35 ویں صدر جان ایف کینیڈی کے وائٹ ہاؤس میں پہنچتے ہی ان کی ملازمت میں کلینر سے باورچی میں ترقی کر دی گئی۔ جان ایف کینیڈی کی اہلیہ نے ان ولسن روز ویلٹ جرمن کی صلاحیتوں اور حاضر دماغی سے متاثر ہو کر انہیں باورچی کے عہدے پر ترقی دی تھی اور پھر وہ ملازمت کے آخری دور یعنی 2012 تک اسی عہدے پر رہے مگر وہ اس دوران صدور کے لیے کھانے بنانے سمیت دیگر خدمات بھی سرانجام دیتے رہے۔ ولسن روز ویلٹ نے 1957 سے 2012 تک وائٹ ہاؤس میں خدمات سرانجام دیں اور انہوں نے 63 سال میں 11 صدور کے ساتھ کام کیا۔ انہوں نے ڈی آئزن ہاور سے لے کر جان ایف کینیڈی، لنڈن بی جانسن، رچرڈ نکسن، گیرالڈ فورڈ، جمی کارٹر، رونالڈ ریگن، جارج ایچ ڈبلیو بش، بل کلنٹن، جارج ڈبلیو بش اور براک اوباما کے ساتھ کام کیا۔ امریکی نشریاتی ادارے سی این این کے مطابق ولسن روز ویلٹ نے خرابی صحت کے باعث 2003 میں ملازمت سے علیحدگی بھی اختیار کر لی تھی تاہم بعد ازاں انہوں نے دوبارہ ملازمت حاصل کی مگر 2011 میں ان کی طبیعت بگڑنے لگی تو 2012 میں انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وائٹ ہاؤس کو خیرباد کہہ دیا۔ زائد العمری کے باعث اگرچہ ولسن روز ویلٹ جرمن کو دیگر بیماریاں بھی لاحق تھیں تاہم امریکا میں تیزی سے پھیلنے والی کورونا کی وبا نے بھی انہیں متاثر کیا اور ان میں کورونا کی علامات ظاہر ہوئیں۔ کئی دن تک کورونا سمیت دیگر بیماریوں کی وجہ سے شدید علالت میں رہنے کے بعد ولسن روز ویلٹ جرمن 16 مئی کو چل بسے اور ان کی موت پر براک اوباما سمیت دیگر سابق امریکی صدور نے افسوس کا اظہار بھی کیا۔

جے پور کے راجہ مادھوسنگھ راجہ داہر کیسے بن گئے؟

تحریر: ریاض سہیل

پاکستان میں گذشتہ ایک سال کے دوران دو بار سندھ کے راجہ داہر سوشل میڈیا پر زیر بحث رہے ہیں۔ پہلا موقع وہ تھا جب پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مجسمہ لگانے کی بات ہوئی اور دوسرا وہ جب سندھ کے نوجوانوں نے سوشل میڈیا پر راجہ داہر کو قومی ہیرو قرار دینے کی مہم چلائی تھی۔ راجہ داہر کو قومی ہیرو قرار دینے کی مہم دس رمضان کو چلی اور تاریخی حوالوں کے مطابق سندھ کے حکمران راجہ داہر کو محمد بن قاسم نے اسی روز شکست دی تھی۔ دونوں مرتبہ سوشل میڈیا پر راجہ داہر کی ایک خیالی تصویر بھی شیئر کی گئی جس میں وہ تلوار ہاتھ میں لیے مخملی چوغے میں ملبوس نظر آتے ہیں، لیکن کیا یہ تصویر واقعی راجہ داہر کی تھی؟

پاکستان کے نامور آرٹسٹ، کارٹونسٹ اور فوٹوگرافر خدا بخش ابڑو نے فیس بک پر اپنی ایک تحریر میں انکشاف کیا کہ یہ تصویر دراصل جے پور کے مہاراجہ سوائے مادھوسنگھ دوئم کی ہے۔ فیس بک پر انھوں نے تحریر کیا کہ سوشل میڈیا پر راجہ داہر کی تصاویر کا سیلاب آیا ہوا تھا جس میں راجہ داہر کو ہیرو قرار دیا جا رہا تھا لیکن یہ تصاویر ان کے لیے جانی پہچانی تھیں کیونکہ انھوں نے ان تصاویر کو پہلے بھی دیکھا تھا اور ان کی کتابوں کی ذاتی کلیکشن میں جے پور کی ایک کتاب میں بھی موجود ہے۔ یہ مہاراجہ سوائے مادھوسنگھ کی تصویر تھی کسی صاحب نے راجہ داہر پر کتاب شائع کی اور اس پر یہ تصویر لگا دی۔ سوشل میڈیا کی نوجوان نسل نے کمپیوٹر اور فون کے سامنے بیٹھ کر بغیر کسی معلومات اور تحقیق کے اس تصویر کو شیئر کر دیا۔

اس تصویر کو راجہ داہر کی تصویر بنا کر پیش کیا جاتا ہے در حقیقت یہ جے پور کے راجہ مادھو سنگھ ہیں

خدا بخش ابڑو کی آرٹسٹ دوست وشیترا منی کام نے بھی اس پوسٹ کی تصدیق کی کہ یہ مادھوسنگھ ہیں۔ جنوری میں انھوں نے ایک میوزیم میں یہ تصویر دیکھی تھی۔

خدا بخش ابڑو نے انھیں جواب دیا کہ وہ بھی تین مرتبہ اس میوزیم میں جا چکے ہیں۔ نامور شاعر اور اکیڈمی ادبیات کے چیئرمین افتخار عارف نے بھی تصدیق کی اور لکھا کہ بہت درست تحقیق۔ خدا بخش ابڑو نے بی بی سی سے بات کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کا سندھ کے صحرائے تھر سے لگاؤ ہے اس لیے راجستھان ان کے باعث کشش رہا ہے اسی لیے وہ جے پور کئی بار جا چکے ہیں۔

مہاراجہ سوائے مادھوسنگھ کون تھے؟

مہاراجہ سوائے مادھوسنگھ جے پور کے راجہ تھے جو 1880 سے لے کر 1922 تک تخت نشین رہے۔ انھیں راجہ رام سنگھ دوئم نے گود لیا تھا کیونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ تاریخی حوالوں کے مطابق مہاراجہ سوائے مادھوسنگھ نے جے پور ریاست میں ترقی کا دور شروع کیا اور اس کو جدت بخشی۔ انھوں نے سنگل گیج ریلوے لائن کا آغاز کیا جس سے جے پور کا کئی دیگر ریاستوں سے رابطہ ہوا۔ انھوں نے ہسپتال، یونیورسٹیاں اور رہائشی کالونیاں قائم کیں اور انھیں نے جے پور کو 'پنک سٹی' میں تبدیل کیا تھا۔ سوائے مادھوسنگھ تاج برطانیہ کے وفادار تھے۔ انھیں 13 راجپوتانہ رجمنٹ کا اعزازی کرنل مقرر کیا گیا تھا۔ انھوں نے چترال اور جنوبی افریقہ سمیت کئی جنگی محاذوں پر برطانوی فوجیوں کی اسلحے اور افرادی قوت میں مدد کی تھی۔ سوائے مادھولال جے پور کے پہلے حکمران تھے جنھوں نے سمندر عبور کیا اور انگلستان گئے۔ ریاست کی ترقی اور فلاح کے ساتھ وہ مذہبی رجحان رکھتے تھے۔ ملکہ وکٹوریا کے انتقال کے بعد ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کے لیے انھیں مہاراجہ گوالیار اور بیکانیر کے ساتھ مدعو کیا گیا تو وہ کافی پریشان ہوئے جس کے بعد مشیران کا اجلاس طلب کیا گیا اور اس کا حل نکالا گیا۔

مہاراجہ نے ایک بحری جہاز کرائے پر حاصل کیا، جس میں کئی ہزار لیٹر گنگا جل

بھرا گیا اور گنگا کا پانی رکھنے کے لیے چاندی کے بڑے برتن بنوائے گئے۔اس کے ساتھ جہاز میں عبادت کے لیے ایک کمرہ تیار کیا گیا اور ملازمین پر پابندی لگائی گئی کہ کوئی بھی گوشت یعنی مچھلی استعمال نہیں کرے گا۔

راجہ داہر کون تھے؟

راجہ داہر آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ کے حکمران تھے۔ وہ راجہ چچ کے سب سے چھوٹے بیٹے اور برہمن خاندان کے آخری حکمران تھے۔ سندھیانہ انسائیکلوپیڈیا کے مطابق مہابھارت سے قبل کئی کشمیری برہمن خاندان سندھ آ کر آباد ہوئے یہ پڑھا لکھا طبقہ تھا، سیاسی اثر ورسوخ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے رائے گھرانے کی 184 سالہ حکومت کا خاتمہ کیا اور چچ پہلا برہمن بادشاہ بنا۔آٹھویں صدی میں بغداد کے گورنر حجاج بن یوسف کے حکم پر ان کے بھتیجے اور نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کر کے راجہ داہر کو شکست دی اور یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ سندھ میں عرب تاریخ کی پہلی کتاب چچ نامہ یا فتح نامہ کے مترجم علی کوفی لکھتے ہیں کہ سری لنکا کے راجہ نے بغداد کے گورنر حجاج بن یوسف کے لیے کچھ تحائف بھیجے تھے جو دیبل بندرگاہ کے قریب لوٹ لیے گئے۔ان بحری جہازوں میں خواتین بھی موجود تھیں۔ کچھ لوگ فرار ہو کر حجاج کے پاس پہنچ گئے اور انھیں بتایا کہ خواتین آپ کو مدد کے لیے پکار رہی ہیں۔مؤرخ کے مطابق حجاج بن یوسف نے راجہ داہر کو خط لکھا اور حکم جاری کیا کہ خواتین اور لوٹے گئے مال واسباب کو واپس کیا جائے تاہم راجہ داہر نے انکار کیا اور کہا کہ یہ لوٹ ماران کے علاقے میں نہیں ہوئی۔ سندھ کے بزرگ قوم پرست رہنما جی ایم سید حملے کے اس جواز کو مسترد کرتے تھے۔انھوں نے سندھ کے سورما نامی کتاب میں لکھا کہ ہوسکتا ہے کہ بحری قزاقوں نے لوٹ مار کی ہو ورنہ راجہ داہر کو اس سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟ یہ الزام تراشی ہے ورنہ اس سے قبل عربوں نے جو سندھ پر 14 بار حملے کیے اس کا کیا جواز تھا۔

قدیم زمانے کی تصوراتی تصاویر

پاکستان اور انڈیا کے میوزیم میں مغل دربار شہزادہ اور شہزادیوں کی کئی تصاویر موجود ہیں جبکہ قیام پاکستان سے قبل موجود ریاستوں کے حکمرانوں کی بھی 18 ویں اور 19 ویں صدی کی تصاویر موجود ہیں۔ آرٹسٹ خدا بخش ابڑو کا کہنا ہے کہ قدیم زمانے کی تصوراتی تصویریں پینٹ کی جاتی ہیں جیسے سندھ میں صوفی شعرا شاہ عبدالطیف بھٹائی اور سچل سرمت کی تصاویر بنائی گئیں۔ تاہم ان کا کہنا ہے کہ راجہ داہر کا کوئی تصوارتی خاکہ فی الحال موجود نہیں ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جو راجہ داہر پر تحقیق کر رہے ہیں اور انھیں ہیرو مانتے ہیں ان سے ان کو کوئی اختلاف نہیں لیکن کسی آرٹسٹ سے ان (راجہ داہر) کی تصویر بنوا لیں بجائے دوسروں کی تصاویر کو ان کی تصویر قرار دینے کے۔(بشکریہ بی بی سی اُردو)

❁❁❁

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹر نیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹر نیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

لاہور انٹرنیشنل رسالہ کی
توسیع اشاعت میں حصہ لینا
آپ کا قومی فرض ہے۔

شعبہ انٹرنیشنل

آئن سٹائن کی سب سے بڑی غلطی؟

تحریر: قصی ملک

ڈارک انرجی کا نام تو سب نے سن رکھا ہے لیکن میں فی الوقت کونیاتی مستقل یا پھر صرف لیمبڈا ہی کہوں گا۔ کہتے ہیں آئن سٹائن نے اسے اپنے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کہا تھا۔ کچھ دن قبل مجھے ایک سوال ملا جو ڈارک انرجی یا کونیاتی مستقل کے متعلق تھا۔ یہ سوال بہت دلچسپ تھا جو مجھے ایک کہانی کی طرف لے جاتا ہے جس کے ساتھ آئن سٹائن کا محبت ونفرت کا تعلق رہا ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ جب آئن سٹائن نے اپنا عمومی نظریہ اضافیت دیا تو اس نے اس کو اس نے ایک حقیقی کائنات پر لاگو کرنا چاہا۔ یاد رہے کہ یہ وہ وقت ہے جب پس منظری شعاعوں یا دوسری کہکشاؤں کے بارے میں اتنا نہیں معلوم تھا اور ظاہر ہے آئن سٹائن بھی اس سے بے خبر تھا۔ آئن سٹائن نے ایک ایسی کائنات کا تصور کیا جو مادہ اور شعاعوں (matter and radiations) سے بنی ہوئی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ ہماری کائنات میں مادہ بھی موجود ہے اور شعاعیں بھی۔ اصل میں ان شعاعوں کو آپ ضیایئے یا فوٹان کہہ سکتے ہیں۔ اور جن کو آپ ہر لمحے اپنے جسم میں جذب کر رہے ہیں۔ جب ہم آئن سٹائن کی عمومی اضافیت کی مساواتوں کو حل کرتے ہیں تو جو ہمارے پاس جو مساوات آتی ہے اس میں مادہ کے لیے کمیت اور شعاعوں کے لیے پریشر یا دباؤ کے رکن موجود ہیں۔ لیکن آئن سٹائن نے یہ سوچا کہ کائنات میں شعاعوں کی نسبت مادہ کی مقدار بہت زیادہ ہے اور اس طرح اس نے شعاعوں کے دباؤ والے رکن کو مساوات حل کرتے وقت نظر انداز کر دیا۔

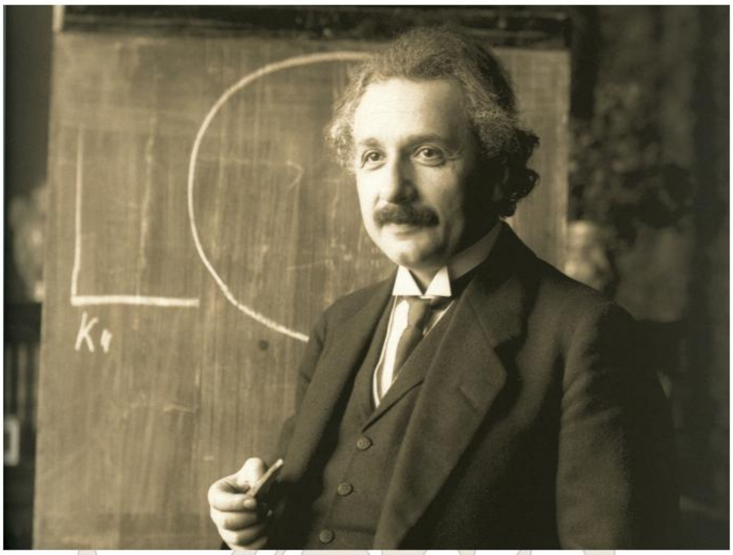

ڈارک انرجی کا نام تو سب نے سن رکھا ہے لیکن میں فی الوقت کونیاتی مستقل یا پھر صرف لیمبڈا ہی کہوں گا۔ کہتے ہیں آئن سٹائن نے اسے اپنے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کہا تھا۔

کچھ دن قبل مجھے ایک سوال ملا جو ڈارک انرجی یا کونیاتی مستقل کے متعلق تھا۔ یہ سوال بہت دلچسپ تھا جو مجھے ایک کہانی کی طرف لے جاتا ہے جس کے ساتھ آئن سٹائن کا محبت ونفرت کا تعلق رہا ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ جب آئن سٹائن نے اپنا عمومی نظریہ اضافیت دیا تو اس نے اس کو اس نے ایک حقیقی کائنات پر لاگو کرنا چاہا۔ یاد رہے کہ یہ وہ وقت ہے جب پس منظری شعاعوں یا دوسری کہکشاؤں کے بارے میں اتنا نہیں معلوم تھا اور ظاہر ہے آئن سٹائن بھی اس سے بے خبر تھا۔ آئن سٹائن نے ایک ایسی کائنات کا تصور کیا جو مادہ اور شعاعوں (matter and radiations) سے بنی ہوئی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ ہماری کائنات میں مادہ بھی موجود ہے اور شعاعیں بھی۔ اصل میں ان شعاعوں کو آپ ضیایئے یا فوٹان کہہ سکتے ہیں۔ اور جن کو آپ ہر لمحے اپنے جسم میں جذب کر رہے ہیں۔ جب ہم آئن سٹائن کی عمومی اضافیت کی مساواتوں کو حل کرتے ہیں تو جو ہمارے پاس جو مساوات آتی ہے اس میں مادہ کے لیے کمیت اور شعاعوں کے لیے پریشر یا دباؤ کے رکن موجود ہیں۔ لیکن آئن سٹائن نے یہ سوچا کہ کائنات میں شعاعوں کی نسبت مادہ کی مقدار بہت زیادہ ہے اور اس طرح اس نے شعاعوں کے دباؤ والے رکن کو مساوات حل کرتے وقت نظر انداز کر دیا۔ اس وقت کے موجود علم کے مطابق آئن سٹائن نے یہ سوچا کہ یہ کائنات ساکن حالت میں ہے۔ ایسا اس نے اس لیے سوچا کیوں کہ اس وقت ملکی وے کہکشاں (یہ وہ کہکشاں ہے جس میں ہمارا نظام شمسی موجود ہے) کے علاوہ کسی اور کا علم نہیں تھا۔ چنانچہ آئن سٹائن نے خود سے سوال کیا کہ کیا ایک ایسی کائنات، جس میں صرف مادہ موجود ہو، ساکن ہو سکتی ہے؟ جواب واضح تھا۔ آئن سٹائن کی اپنی مساوات یہ بتا رہی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت میں ایک ایسی کائنات جس میں صرف مادہ موجود ہو، وہ پھیل سکتی ہے یا سکڑ سکتی ہے، لیکن ساکن نہیں ہو سکتی۔

یہ بات آسانی سے ریاضی سے ثابت کی جا سکتی ہے لیکن فی الوقت آپ میری بات پر یقین رکھیں۔ ایک ساکت کائنات صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں سرے سے کچھ موجود ہی نہ ہو۔ ایک خالی کائنات۔ ایک ایسی کائنات جو ساکت ہو اور اس میں صرف مادہ موجود ہو وہ وقت کے ساتھ سکڑنے لگے گی کیوں کہ مادہ دوسرے مادہ کو کشش کرے گا۔ یا پھر ایک ایسی

کائنات جس میں صرف مادہ ہو اور وہ پھیل رہی ہو تو وہ یا تو پھیلتی جائے گی یا ایک خاص وقت پر سکڑنا شروع کر دے گی لیکن ساکن ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں آئن سٹائن نے اس پھیلتی کائنات کو ساکن بنانے کے لیے اپنی عمومی اضافیت کی مساوات میں ایک نیا رکن شامل کیا جو اب لیمبڈا یا کونیاتی مستقل یا ڈارک انرجی (اس پر بات آگے چل کر ہوگی) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس مستقل کی وجہ سے ان مساواتوں میں، جو ہمیں کائنات کے ارتقاء کے بارے میں بتاتی ہیں (ان کو فرائیڈ مین کی مساواتیں کہا جاتا ہے)، وہ ایک ساکن کائنات کو ظاہر کرنے لگ جاتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ یہ کائناتی مستقل آئن سٹائن کی مساوات میں ایک ایسے عنصر کو شامل کر دیتا ہے جو قوت دفع (repulsive force) کا موجب ہے۔ یہ قوت دفع کائنات میں موجود مادہ سے پیدا ہونے والی قوت کشش کو منسوخ کر دیتی ہے اور نتیجتاً ایک ساکن کائنات وجود میں آتی ہے۔ آئن سٹائن نے اس ساکن کائنات کی جزئیات 1917 میں شائع کر دیں تھی لیکن وہ اس سے خوش نہیں تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ ایسا کرنے سے اس کی اصل مساوات کی خوبصورتی ماند پڑ گئی ہے۔ برہان جمال کے علاوہ ایک ساکن کائنات میں اور بھی بہت سے مسائل ہیں، مثال کے طور پر ایک ساکن کائنات انتہائی غیر قیام پذیر ہوگی۔ وجہ مندرجہ ذیل ہے۔ چونکہ کائناتی مستقل ایک مستقل ہے، یعنی اس کی قیمت وقت کے ساتھ بدلتی نہیں ہے۔ اب اگر ہم ایسی کائنات کو تھوڑا سا پھیلائیں تو مادے کی کثافت میں کمی آئے گی اور اس سے قوت کشش میں بھی کمی آ جائے گی۔ اس کمی کی وجہ سے قوت دفع میں اضافہ ہو جائے گا اور کائنات پھیلنے لگے گی۔ اس پھیلاؤ سے مادے کی کثافت میں مزید کمی آئے گی اور کائنات اور تیزی سے پھیلے گی۔ نتیجہ ایک ایسی کائنات کی صورت میں نکلے گا جو پھیلتی ہی جائے گی۔ یہی صورت مخالف سمت میں ہوگی اگر ہم مادے کی مقدار کو تھوڑا سا بڑھا دیں۔ تو کائنات سکڑے گی اور یہ عمل جاری رہے گا۔ یعنی ایک ایسی کائنات جو وقت کے ساتھ سکڑتی جائے گی۔ دونوں صورتوں میں کائنات ساکن نہیں ہوگی۔ آئن سٹائن اس کائناتی مستقل سے جان چھڑانے کے موقع کی تلاش میں تھا۔ یہ موقع اسے 1929 میں ملا جب ایڈون ہبل نے ایک مقالہ شائع کیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کہکشائیں ایک دوسرے سے دور جا رہی ہیں۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیں کہ جب آئن سٹائن نے اس مستقل سے جان چھڑانی چاہی تو باقی سائنسدانوں نے اسے اپنانا شروع کر دیا۔ دراصل مسئلہ یہ ہوا کہ ہبل نے کہکشاؤں کے پھیلاؤ کی رفتار بھی ماپی۔ یہ ایک انتہائی غلط پیمائش تھی لیکن اس پیمائش کی بنا پر جب اس نے کائنات کی عمر کا تخمینہ لگایا تو وہ دو ارب سال آیا۔

اسی دوران ماہر عرضیات آرتھر ہولمز نے زمین کی عمر کا تخمینہ تین ارب سال لگایا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہبل کی پیمائش میں کوئی خرابی ہے کیوں کہ ہولمز کی پیمائش اس وقت کافی مستند تھی۔ چنانچہ اسی مستقل کو جس سے آئن سٹائن کے لیے اب جان چھڑانے کا وقت آیا تھا باقی سائنسدانوں نے اسے گلے لگا لیا کیوں کہ اس مستقل کی مدد سے وہ کائنات کی عمر کو وہ کم از کم تین ارب سال سے بڑھا سکتے تھے۔ خیر ایسا کرنے کی بھی نوبت نہیں آئی کیوں کہ ہبل نے کائنات کے پھیلاؤ کی رفتار کی پیمائش میں غلطی کی تھی۔ جب اس کو صحیح ماپا گیا تو کائنات کی موجودہ عمر کی صورت میں نتیجہ نکلا جو کہ تقریباً چودہ ارب سال ہے۔ اب ایک سوال باقی رہتا ہے کہ ڈارک توانائی کیا چیز ہے؟ چلیں اس سوال کے جواب کی کھوج لگاتے ہیں۔ لیکن پہلے یہ سمجھ لیں کہ کائنات میں بہت ساری قوتیں عمل فرما ہیں۔ مثال کے طور پر کشش کی قوت جو کہ مادے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب مادے کی بات کی جاتی ہے تو اس سے مراد وہ مادہ جو الیکٹران اور پروٹان سے مل کر بنا ہے۔ اس کو Baryonic matter کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کائنات میں ضیایئے یا فوٹان بھی موجود ہیں جن کو ہم نے پہلے ہی Radiations کہہ دیا ہے، اس کے علاوہ نیوٹرینو بھی موجود ہیں اور اور بھی بہت کچھ۔ یہ کائنات ایک عالم حیرت ہے۔ ہم ان سارے ارکان کو اجزا کہہ لیتے ہیں۔ ڈارک توانائی بھی ان میں سے ایک ہے۔ فرائیڈ مین کی مساواتیں، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اور جو کائنات کے ارتقاء کو بیان کرتی ہیں، ان کو آپ اپنی مرضی کے اجزا کے لیے کسی بھی شکل میں ڈھال کر ایک ماڈل کائنات بنا سکتے ہیں۔ ڈارک توانائی کے لیے ہمیں کائنات کا کوئی ایسا جزیا رکن چاہیے جس کی مقدار کائنات کے سکڑنے یا پھیلنے کے ساتھ تبدیل نہ ہوتی ہو۔ اسی کا ایک امید وار خلا کی توانائی یا vacuum energy ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کلاسیکی طبیعیات میں خلا ایک ایسی شے ہے جس میں کچھ موجود نہیں ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا جیسا کہ کنگ لیئر (King Kear) نے کہا تھا کہ "nothing can come from nothing"۔ لیکن جب کوانٹم میکانیات کی رو سے دیکھا جائے تو خلا ایک انتہائی متحرک شے ہے جس میں ہر لحظے کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ ہائزنبرگ کا اصول عدم تیقن ہمیں بتاتا ہے کہ خلا میں بہت کم دورانیے کے لیے ذرات (مادہ کے ذرات) پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں۔ بالکل جیسے حقیقی ذرات کے ساتھ توانائی منسوب کی جاتی ہے ویسے ہی ان خلا میں پیدا ہونے والے ذرات کے ساتھ بھی ایک توانائی منسلک ہوتی ہے اور اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کائنات کیا کر رہی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس توانائی کو ابھی تک ماپا نہیں جا سکا اس لیے ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ نظریاتی طور پر جو پیشین گوئیاں ہیں ان میں اور کائنات کی موجودہ کریٹکل کثافت میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس لیے یہ وقت ہی بتائے گا کہ ڈارک توانائی کیا چیز ہے۔

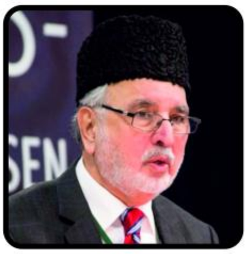

17 مئی۔ناروے کا قومی دن (یومِ آئین)

تحریر: (زرتشت منیر۔ناروے)

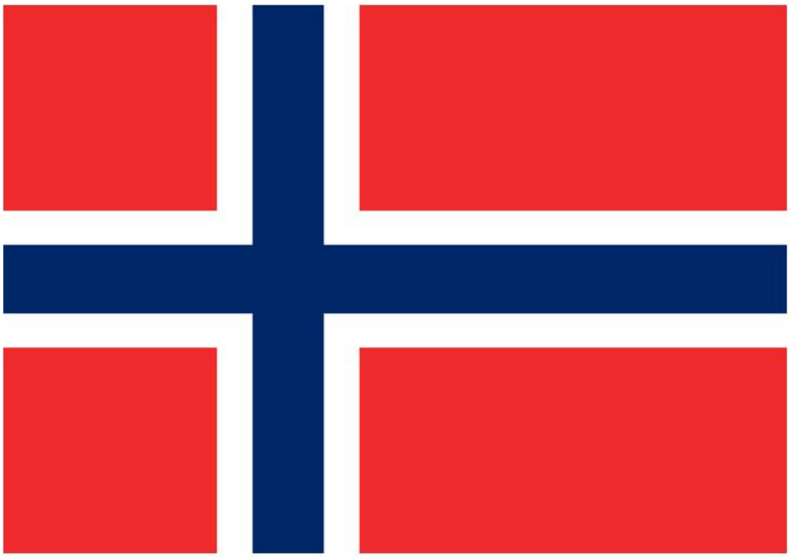

ناروے کا ملک برّاعظم یورپ اور سیکنڈے نیوین ممالک کے شمال مغرب میں واقع ہے اس ملک کے شمالی حصّہ سے قطب منجمد شمالی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ ناروے کے شمالی علاقے میں سورج چھ ماہ کے عرصہ میں غروب نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔شمالی ناروے کے مقام "نارتھ کیپ" میں نصف شب کے سورج کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔یہاں سردیاں بہت سخت ہوتی ہیں۔موسم سرما کی تاریکی میں یہاں ناردرن لائٹس بھی دیکھی جاسکتی ہیں جو بہت دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔اس ملک کی آبادی ساڑھے پانچ ملین ہے۔مہاجرین میں سویڈن، پولینڈ،فن لینڈ،عراق، کردستان، ایران اور پاکستان کے لوگ شامل ہیں۔ملک کا کل رقبہ 385،207 مربع کلومیٹر ہے۔فن لینڈ اور سویڈن کے ساتھ سرحد ملتی ہے جبکہ سویڈن کے ساتھ سرحد بہت لمبی ہے۔ناروے کا ساحلِ سمندر گرم خلیجی لہروں کی وجہ سے سال بھر کھلا رہتا ہے۔جبکہ اسی عرض بلد پر واقع دوسرے علاقوں کا سمندر منجمد رہتا ہے۔یہاں مقتدرِ اعلیٰ تو بادشاہ ہے لیکن امورِ سلطنت وزیر اعظم، ان کی کابینہ اور پارلیمنٹ (ستورتنگ) چلاتی ہے۔سرکاری مذہب عیسائیت ہے۔بادشاہ کا نام" ہیرالڈ پنجم" جبکہ وزیر اعظم محترمہ" آرنے سولبرگ" ہیں۔یہاں ایک مشہور قوم بھی بستی ہے جن کی اپنی علیحدہ زبان اور الگ کلچر ہے ان کی اپنی پارلیمنٹ اور حکومت ہے۔یہ قوم سویڈن اور فن لینڈ کے علاقے میں بھی پائی جاتی ہے یہ لوگ" سامی" کہلاتے ہیں۔ناروے کا ملک اپنے خوبصورت قدرتی مناظر، گہرے پانی، بلند سرسبز پہاڑ، چشمے، آبشاروں اور گلیشیئرز کی وجہ سے دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔

قومی دن

ہر سال 17 مئی کو ناروے کا قومی دن منایا جاتا ہے۔اسکولوں، دفاتر، اور تمام تجارتی اداروں میں اس دن سرکاری طور پر عام تعطیل ہوتی ہے۔یہاں قومی دن کی تقریبات پوری دنیا سے نرالی اور انوکھی ہوتی ہیں۔ اس دن فوجی پریڈ، سلامی اور توپوں کی گھن گرج سنائی نہیں دیتی۔بلکہ اس روز ہنستے مسکراتے بچے نئے نویلے اور خوبصورت کپڑے پہنے، ہنستے گاتے اپنے اسکولوں کے ہمراہ قومی دن کے جلوس میں شریک ہوتے ہیں، پھر دن بھر وہ بچے اپنے دوستوں اور ہمجولیوں کے ہمراہ اس دن کی خوشیاں مناتے ہیں۔خوشی اور گرم جوشی کا یہ اظہار محض بچوں کی حد تک نہیں ہے اس روز چھوٹے، بڑے، جوان اور بوڑھے یکساں مسرت اور جوش وخروش سے اس دن کی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں۔ جو بچے جلوس میں شامل نہیں ہوتے، ان کے والدین خاص طور پر انہیں تیار کر کے شہر لے جاتے ہیں۔طرح طرح کے باجے کھلونے اور کھانے پینے کی اشیاء انہیں خرید کر دیتے ہیں۔سرکاری عمارات کے علاوہ گھروں پر بھی نارویجن جھنڈے اور جھنڈیاں لہرائی جاتی ہیں۔رات کو کم وبیش ہر گھر پر خوبصورت چراغاں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ناروے میں قومی دن کو اس تنوع اور جوش سے منانے کی وجہ سے ہی باہر سے آنے والوں کے لئے اس کا تجربہ مسحور کن ہوتا ہے۔متعدد ملکوں سے سیاح خاص طور سے اس دن کا مشاہدہ کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔اس ملک میں موجود غیر ملکی سفیر، تجارتی نمائندے اور دیگر لوگ بھی 17 مئی کی تقریبات کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ناروے دنیا کا واحد ملک ہے جہاں قومی دن کے موقع پر نغمے بکھیرے جاتے ہیں اور بچے اس دن کو منانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔اس دن جلوسوں کی رپورٹنگ کے لئے سارا دن ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر پروگرام نشر ہوتے ہیں اور ان کے شرکاء تاریخی اور سماجی وثقافتی حوالوں سے اس دن کی اہمیت اور قدر وقیمت کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہ دن اس ملک میں آباد سب لوگوں کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسکولوں کے بچے 17 مئی کے جلوس میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔تارکین وطن بچے بھی اس جلوس کا اہم حصہ ہوتے ہیں اور دیگر بچوں کی طرح ہی جوش

وخروش سے اس موقع پر شریک ہوتے ہیں اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ 17 مئی کا قومی دن 1814ء کے "یوم آئین" کے حوالے سے منایا جاتا ہے۔ اس تاریخی دن اوسلو سے 50 کلومیٹر دور آئیدسوول (Eidsvàl) کے مقام پر ملک ناروے کے نمائندوں نے کئی ہفتے کی بحث وتمحیص اور غور وفکر کے بعد ناروے کا آئین منظور کیا تھا۔ یہ دستاویز ایک خود مختار ناروے کے حصول کے لئے تیار کی گئی تھی۔ ناروے اس وقت ڈنمارک کے ماتحت تھا۔ اسی سال جنوری میں ڈنمارک نے ناروے کو سویڈن کے حوالے کر دیا تھا اور اس طرح ناروے سویڈن کے ساتھ یونین کا حصہ بن گیا۔ 17 مئی 1814ء کا آئین اس یونین کو مسترد کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا جسے ملک کے ہر طبقے کی بلا تفریق حمایت حاصل تھی۔ اس مطالبہ کے پیشِ نظر اسی سال ناروے اور سویڈن کے درمیان جنگ بھی ہوئی۔ 4 نومبر 1814ء کو ناروے کو سویڈن کی یونین کا باقاعدہ حصہ بنا دیا گیا۔ البتہ سویڈن کا بادشاہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ ناروے اپنے معاملات میں خود مختار ہوگا اور سویڈن کے ساتھ اس کا الحاق محض رسمی ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں ملک سویڈن کے بادشاہ کارل یوہان کے ماتحت ایک متحدہ مملکت قرار پائے۔ امور خارجہ بہر حال سویڈن کے اختیار میں رہے۔ ناروے کے لوگوں کو یہ انتظام قبول نہیں تھا اور انہوں نے اس یونین کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اور کسی نہ کسی طور سے ہر سال 17 مئی کے دن خود مختاری کے حوالے سے مظاہروں کا اہتمام عمل میں آنے لگا۔ سویڈن کے بادشاہ کارل یوہان نے 1828ء میں 17 مئی کا دن منانے پر پابندی لگا دی۔ لیکن 1829ء میں ایک ایسا واقعہ ہوا کہ ناروے کے لوگوں نے اس پابندی کو مسترد کر دیا اور مکمل خود مختاری کی آواز کو بلند کرنا شروع کر دیا۔ ہوا یوں کہ 17 مئی 1829ء کو Constitution نامی ایک جہاز اوسلو (جو ان دنوں کرسٹیانیا کہلاتا تھا) کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ ساحل پر موجود لوگوں نے اپنے "یوم آئین" پر اس نام کے جہاز کو ناروے میں داخل ہوتے دیکھا تو انہوں نے بے اختیار آزادی کے حق میں نعرے لگانے شروع کر دئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد سینکڑوں لوگوں کا مجمع ستورٹنگ (پارلیمنٹ) کے باہر جمع ہو گیا۔ حکومت کی طرف سے انہیں منتشر کرنے کے لئے طاقت استعمال کی گئی اور فوجی دستوں کی مدد سے رات گئے تک لوگوں کو منتشر کیا گیا۔ کچھ لوگ گرفتار ہوا اور بیشتر زخمی ہوئے۔ ناروے کا مشہور ادیب ''ہینرک ورگے لاند'' اس وقت طالب علم تھا اور وہ اس عوامی احتجاج کا عینی شاہد تھا۔ اس نے اس واقعہ کے بعد نوجوان طالب علموں کو جمع کر کے خود مختاری کے لئے باقاعدہ ایک مہم کا آغاز کیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ قیادت ناروے کے ایک ممتاز شاعر کے ہاتھ میں آ گئی۔ اسکول کے بچوں کا پہلا باقاعدہ جلوس اوسلو میں 1870ء میں نکالا گیا اور اس میں صرف لڑکے شامل تھے۔ پہلے جلوس میں صرف 1200 لڑکے شریک ہوئے تھے۔

1889ء سے آزادی کے اس جلوس میں لڑکیاں بھی شامل ہونا شروع ہوئیں۔ اس پر امن اور مسلسل مطالبات اور جدوجہد کے نتیجے میں 7 جون 1905 کو ناروے سویڈن سے علیحدگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح ناروے ایک خود مختار ملک کے طور پر دنیا کے نقشہ پر ابھرا۔ 1906ء سے ناروے کا شاہی خاندان مسلسل ہر سال 17 مئی کو اوسلو میں اپنے محل کی بالکونی سے بچوں کے جلوس کا استقبال کرتا ہے۔ بچے جو رنگ برنگے خوبصورت لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ وہ بادشاہ کو سلامی دیتے ہوئے گزرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ناروے ایک آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن 1319ء میں اسے سویڈن کے ساتھ شامل کر لیا گیا۔ 1380ء میں اسے ڈنمارک کا حصہ بنا دیا گیا۔ ساڑھے چار سو سال بعد 1814ء میں ڈنمارک نے ناروے کو پھر واپس سویڈن کے حوالے کر دیا اور بالآخر 1905ء میں ناروے نے سویڈن سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی آزادی اور خود مختاری کا باقاعدہ اعلان کیا۔ جدید ناروے میں 17 مئی کے دن کو اب کثیر الثقافتی معاشرے کی علامت کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ اس دن تمام قومیتوں کے لوگ بڑے جوش وخروش کے ساتھ اس دن کی تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔ نارویجن خواتین اور مرد اپنے روایتی خوبصورت قومی اور علاقائی لباس زیب تن کرتے ہیں۔ ہر طرف ایک عید کا سا سماں ہوتا ہے۔ امسال کرونا وائرس کے پھیلاؤ کو روکنے کی وجہ سے جلوس اور بڑی بڑی تقریبات کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔ ایسا ناروے کی تاریخ میں پہلی دفعہ ہوا ہے۔ اس سے قبل دو دفعہ جلوس کا پروگرام بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا تھا۔ ناروے میں سرکاری مذہب عیسائیت ہونے کے باوجود دیگر مذاہب کو تبلیغ اور عبادت کی مکمل آزادی ہے۔ چنانچہ بدھ مت اور ہندو مت والوں نے اپنے اپنے ٹمپل تعمیر کر رکھے ہیں جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنے عقیدہ کے مطابق عبادت کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی مساجد تعمیر کی ہیں جہاں پاکستان سے آئے ہوئے ملّاں نفرت انگیز تقاریر کرتے ہیں۔ صرف ایک فرقہ ایسا ہے جو وطن سے محبت کے تقاضے پورا کرتے ہوئے ہر آنے والی آزمائش میں اولو الامر حکومت کے ساتھ مکمل تعاون کرتا ہے۔ اور امن کی ترویج وتبلیغ میں کوشاں ہے۔ یہ فرقہ جماعت احمدیہ ہے۔ جماعت نے یہاں ایک خوبصورت مسجد ''بیت النصر'' تعمیر کی ہے جس کا افتتاح ہمارے پیارے امام حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ نے 2011 میں فرمایا تھا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس ملک کے عوام کو اپنے خالق اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پیشگوئیوں کے مطابق آنے والے امام مہدی علیہ السلام کو پہچاننے کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔ (بشکریہ الفضل انٹرنیشنل)

❁❁❁

کیا ہمیں اپنا نواں سیارہ واپس مل جائے گا؟

تحریر: ابو نائل

ایک زمانہ تھا کہ ہمارے نظام شمسی کے نو سیارے ہوا کرتے تھے۔ یعنی سورج کے گرد نو سیارے گھوما کرتے تھے۔ سب سے دور افتادہ سیارہ پلوٹو تھا۔ اس بیچارے سیارے کو بڑی مشکل سے 1930 میں دریافت کیا گیا۔ یہ سیارہ ہمارے نظام شمسی کا "چھوٹو" تھا۔ اتنا مختصر کہ اس کا حجم ہمارے چاند کے حجم کے تیسرے حصے کے برابر ہوگا۔ برف اور چٹانوں کا بنا ہوا یہ مختصر سا سیارہ خاموشی سے سورج کے گرد گھوم رہا تھا۔ اور اتنا دور تھا کہ کسی کو کوئی تکلیف بھی نہیں پہنچا سکتا تھا اور اپنے مدار میں گھوم رہا ہے۔ جتنا زمین اور سورج کا فاصلہ ہے پلوٹو کبھی اس سے تیس گنا زیادہ دور ہوتا ہے اور کبھی 49 گنا زیادہ دور۔ لیکن انسان کب کسی کو چین سے رہنے دیتے ہیں۔ یہ سوال اٹھنے شروع ہو گئے کہ یہ اتنا چھوٹا سا تو ہے اسے ایک سیارے کا درجہ کیوں دیا ہوا ہے؟

ہمارے نظام شمسی کے بیرونی حصے میں یعنی سیاروں سے بھی پرے ایک حصہ کائپر بیلٹ [Kuiper Belt] کہلاتا ہے۔ اس میں سیاروں سے چھوٹی جسامت رکھنے والے بہت سے اجسام موجود ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ نظام شمسی کی اس بیرونی پٹی میں لاکھوں ایسے اجسام ہوں گے جو کہ سو کلومیٹر سے بڑے سائز کے ہیں۔ اور ان سے چھوٹے اجسام اس کے علاوہ ہیں۔ سورج سے دور ہونے کی وجہ سے یہ پٹی سخت سرد حالت میں ہے۔ اتنی سرد حالت میں کہ نائٹروجن جو زمین پر ہوا کی صورت میں موجود ہے اس پٹی میں برف کی طرح جم جاتی ہے۔ 2005 میں ماہرین فلکیات نے ایرس نام کا ایک وجود اس پٹی میں دریافت کر لیا۔ اور اس کا سائز پلوٹو سے بڑا تھا۔ پھر یہ بحث شروع ہو گئی کہ اگر ہم پلوٹو کو سیارہ کہتے ہیں تو ایرس کو کیوں نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ اگلے سال فلکیات کے علما نے پلوٹو کو سیاروں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ اور اس قسم کے چھوٹے اجسام کو ڈوارف پلینیٹ یعنی بونے سیاروں کا نام دے دیا۔ ان میں سے کئی بونے سیاروں کے ارد گرد ان کے چاند گردش کر رہے ہیں۔ جس طرح زمین کے گرد ایک چاند گردش کر رہا ہے۔ اب سائنسدان اس پٹی یعنی کائپر بیلٹ میں دلچسپی لینے لگے۔ یہ پٹی آہستہ آہستہ گھستی جا رہی ہے۔ اور اس میں سے کئی شہاب ثاقب نکل کر نظام شمسی کے اندرونی حصے کا رخ کرتے رہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے اجسام اتنی منتشر حالت میں گردش کر رہے ہیں تو انہوں نے مل کر بڑے سیارے کیوں نہیں بنا لئے۔ اس کی وجہ ماہرین فلکیات یہ بتاتے ہیں کہ ان کے قریب گردش کرنے والے سیارے نیپچون کی کشش ثقل نے انہیں اتنا پریشان کر رکھا ہے کہ یہ قوت ان اجسام کو پٹخنیاں دیتی رہتی ہے اور یکجا نہیں ہونے دیتی۔ انسان نے جب خلائی جہاز بھیجنے شروع کیے تو 1983 میں ایک خلائی جہاز پائینر 10 آخری سیارے نیپچون کو عبور کر کے اس پٹی کی حدود میں داخل ہوا لیکن زیادہ دور جا کر اس کی تصویریں نہیں بھجوا سکا۔ لیکن انسان نے بھی ٹھان لی کہ نظام شمسی کے اس برفانی علاقے کو دیکھ کر رہے گا۔ لیکن

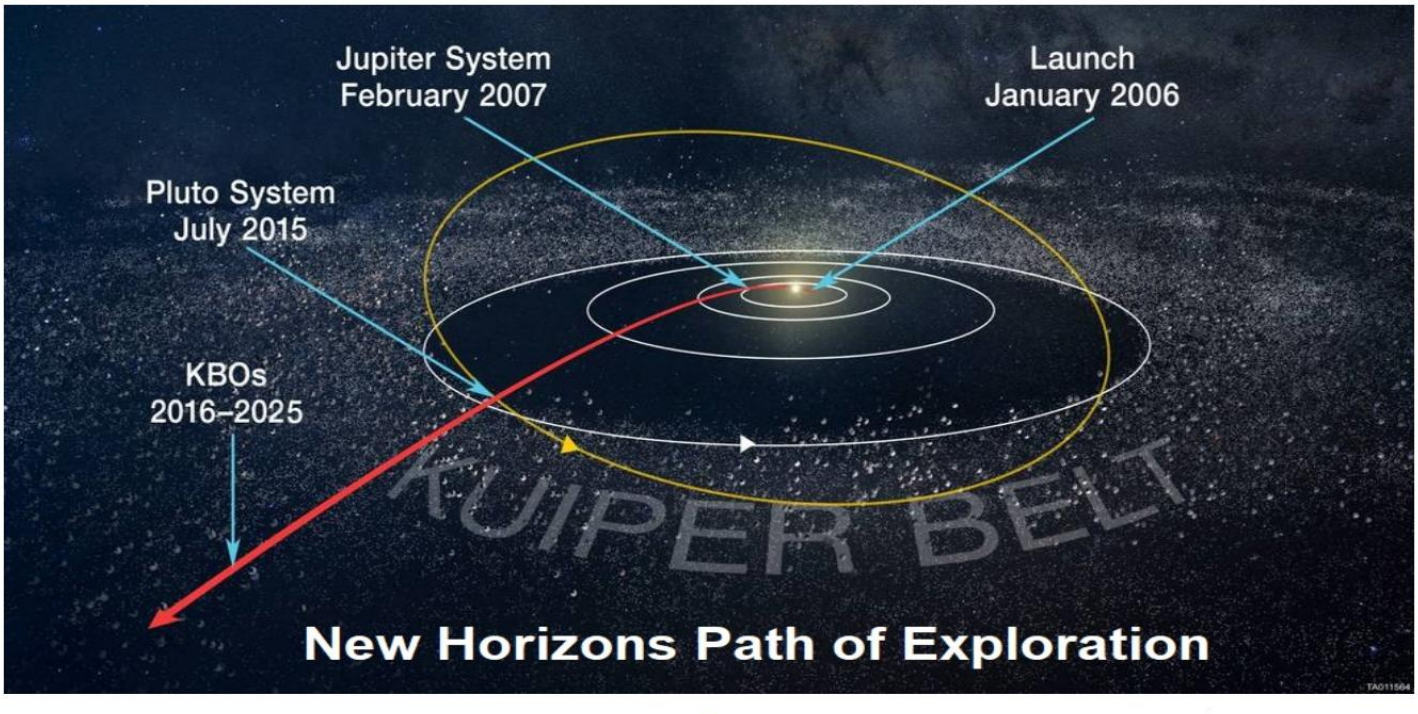

یہ کسی بھی خلائی جہاز کے لئے ایک دو دن کا سفر نہیں تھا، چند ماہ کا سفر نہیں تھا بلکہ سالوں کا سفر کر کے ہی کوئی خلائی جہاز نظام شمسی کے اس دور افتادہ علاقے تک پہنچ سکتا تھا۔ اس غرض کے لئے امریکہ کے خلائی ادارے ناسا نے نیو ہورائزن کے نام سے 478 کلوگرام وزنی ایک خلائی جہاز بنایا۔ اور 19 جنوری 2006 کو اس جہاز کو زمین سے الوداع کر دیا۔ اپریل 2006 یہ جہاز مریخ کے قریب سے گزرتا ہوا آگے بڑھا۔ اگلے سال فروری میں یہ جہاز نظام شمسی کے سب سے بڑے سیارے مشتری کے قریب سے گزرا۔ سائنسدانوں نے اس جہاز کی توانائی بچائی اور اس جہاز کو مشتری کے قریب سے اس طرح گزارا کہ اس سب سے بڑے سیارے کی کشش ثقل نے اس جہاز کو ایک دھکا دیا۔ یہ دھکا اتنا موثر تھا کہ اس جہاز کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔

2010 تک پلوٹو تک کا سفر ابھی نصف طے ہوا تھا۔ 2015 میں اس جہاز نے پلوٹو کے قریب سے اس معزول سیارے کی تصویریں بھجوانی شروع کیں۔ اور پلوٹو کا صحیح قطر ماپنے کا کام بھی کیا۔ پلوٹو کا قطر 2370 کلومیٹر نکلا۔ اور پر موجود بڑے بڑے گلیشیئر دریافت ہوئے۔ اب یہ خلائی جہاز اس برفانی پٹی یعنی کائپر بلٹ کی سیر کر رہا ہے۔ اور وہاں سے تصویریں کھینچ کر بھجوا رہا ہے۔ حال ہی میں اس جہاز نے خلا میں تیرتے ہوئے ایک ڈمبل کے شکل کے ایک وجود کی تصویر بھجوائی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے مٹیالے کروں کو جوڑ دیا گیا ہے۔ مارچ 2019 میں یہ جہاز زمین سے ساڑھے چھ ارب کلومیٹر کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس جہاز کا سفر 2021 میں ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد یہ جہاز دم توڑ کر اس برفانی دنیا میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جائے گا۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں کہ ہمارے سورج کے سیاروں کی تعداد نو سے کم ہو کر آٹھ رہ گئی ہے۔ پلوٹو کو سیارے کے منصب سے معزول کرنے کے پیچھے سب سے زیادہ کیلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے ماہر فلکیات مائک براؤن کا ہاتھ تھا۔ وہ پر امید ہیں کہ وہ اس تعداد کو دوبارہ نو تک پہنچا دیں گے۔ وہ اور ان کی ٹیم دوربین سے نظام شمسی کے افق کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا حساب کتاب یہ بتاتا ہے کہ نواں سیارہ موجود ضرور ہے۔ لیکن سورج سے بہت دور ہے۔ آخری سیارہ نیپچون سورج سے جتنا دور ہے یہ نواں سیارہ اس سے بھی دس پندرہ گنا زیادہ دور رہ کر سورج کے پھیرے لگا رہا ہے۔ ہمیں اس کے زاویے کا بھی اندازہ ہے۔ لیکن ہم ابھی اسے پہچان نہیں پا رہے۔ دیکھ نہیں پا رہے۔ گو کہ اس کے اثرات نظر آ رہے ہیں۔ ایک دن ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔

❁❁❁

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے" ملاہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہوگی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26

❁❁❁

Lahore International Magazine
Instagram: @lahoreintl
Twitter: @lahoreintl
Facebook: lahoreinternational
YouTube: lahoreinternational
Google+: lahoreintl
Contact: +447940077825
Whatsapp: +447940077825
Email: lahoreintlondon@gmail.com

پیٹر رائیٹ اور برٹش سیکرٹ سروس

تحریر: ڈاکٹر شاہد صدیقی

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کیسے کچھ کتابیں پڑھنے والوں کی زندگیاں بدل دیتی ہیں اور بعض کتابیں لکھنے والوں کی زندگیوں میں انقلاب لے آتی ہیں۔ آج یوں ہی میں اپنی سٹڈی میں کتابوں کو ترتیب سے رکھ رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک کتاب پر پڑی، میں نے کتاب کو ریک سے نکال کر میز پر رکھا تو اس کا سرورق دیکھ کر خود ہی مسکرانے لگا اور مجھے اس کتاب سے جڑے بہت سے واقعات یاد آنے لگے۔ یہ پیٹر رائیٹ (Peter Wright) کی کتاب SpyCatcher تھی۔ میں نے کرسی پر ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں تو وہ سارے منظر روشن ہونے لگے، جب آج سے تین دہائیاں پہلے میرا اس کتاب سے تعارف ہوا تھا، جس نے برطانوی اقتدار کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا تھا۔ دراصل یہ کتاب برطانوی سیکرٹ ایجنسی MI 5 کی اندرونی کہانی تھی جسے MI 5 کے ایک سابق اسسٹنٹ ڈائریکٹر پیٹر رائیٹ نے تحریر کیا تھا جس میں ایسی تفصیلات شامل تھیں جو برطانوی حکومت کے لئے حد درجہ خفت کا باعث بنی تھیں۔ یہ 1987ء کی بات ہے جب میں نے اس کتاب کے اقتباسات The Independent اخبار میں پڑھے، ان دنوں میں مانچسٹر یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، اس روز ہاسٹل کے ٹی وی روم میں ہماری گفتگو کا ایک ہی موضوع تھا، پیٹر رائیٹ کے MI 5 کے بارے میں ہوشربا انکشافات۔ اگلے ہی روز اخبارات پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ کتاب کا کوئی بھی اقتباس شائع نہیں کر سکتے۔ اس سے پیشتر کہ کتاب کے مندرجات پر گفتگو کی جائے ہمیں کتاب کے مصنف پیٹر رائیٹ کے بارے میں جاننا ہوگا کہ اس کا پس منظر کیا تھا اور وہ MI 5 میں ملازمت حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہوا۔ پیٹر رائیٹ 9 اگست 1916ء میں برطانیہ کے علاقے ڈربی شائر میں پیدا ہوا۔ اس کے والد مارکونی کمپنی میں سائنٹیفک افسر تھے، وہ وائرلیس بنانے کے ماہر تھے اس لیے بچپن ہی سے پیٹر کو وائرلیس بنانے کے عمل سے دلچسپی تھی۔ پیٹر نے سکول کی تعلیم مکمل کی تو حالات کچھ ایسے بنے کہ وہ یونیورسٹی نہ جا سکا، دوسری جنگ عظیم کی آمد آمد تھی، پیٹر کو بھی مارکونی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ یونیورسٹی کی تعلیم کی کمی اس نے اپنے شوق اور محنت سے پوری کی اور جلد ہی اپنے کام کی وجہ سے سب کی نظروں میں آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روس کے ساتھ سرد جنگ جاری تھی، دونوں ممالک کے جاسوس سرگرم مل تھے، لیکن MI 5 میں جدید سائنسی آلات کا استعمال بہت کم تھا، اس زمانے میں MI 5 کا سربراہ ڈک وائٹ تھا جس نے پیٹر رائیٹ کو MI 5 میں ملازمت دی، یہ 1954ء کا سال تھا۔ پیٹر رائیٹ ایک ذہین اور محنتی نوجوان تھا جو جلد ہی اپنے کام کی وجہ سے سینئر سائنٹیفک افسر کے عہدے پر جا پہنچا۔ پیٹر نے MI 5 میں 22 سال کا طویل عرصہ گزارا۔ اس نے مختلف اسائنمنٹس کیں۔ اسے فائلیں پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا یوں وہ MI 5 کے ان تمام رازوں تک رسائی حاصل کر چکا تھا جن کا انکشاف برطانوی حکومت کی بنیادیں ہلا سکتا تھا۔ وہ خود بہت سے ایسے آپریشنز کا حصہ تھا جن کی خبر برطانوی حکومت کو بھی نہیں تھی۔ اس وقت MI 5 ایک ایسا بدمست ہاتھی تھا جو برطانوی حکومت کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ جب پیٹر رائیٹ 1954ء میں MI 5 میں شامل ہوا تو اسے یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ اس کی مارکونی کمپنی والی ملازمت کا عرصہ پینشن کے لئے شامل کیا جائے گا، لیکن جب 1976ء میں اس کی ریٹائرمنٹ کا وقت آیا تو اسے بتایا گیا کہ اسے پنشن کے واجبات نہیں ملیں گے۔ وہ کیا حالات تھے جو اس کی پنشن کی راہ میں رکاوٹ بنے، ان کا ذکر آگے آئے گا۔ پنشن سے محرومی پیٹر کے لئے ایک دھچکا تھا، جس ادارے کے لئے اس نے 22 سال دیے، اس نے اسے پنشن سے محروم کر دیا تھا۔ پیٹر کا غصہ دیدنی تھا، اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کی ساری زندگی بے ثمر گزر گئی، وہ دل برداشتہ ہو کر

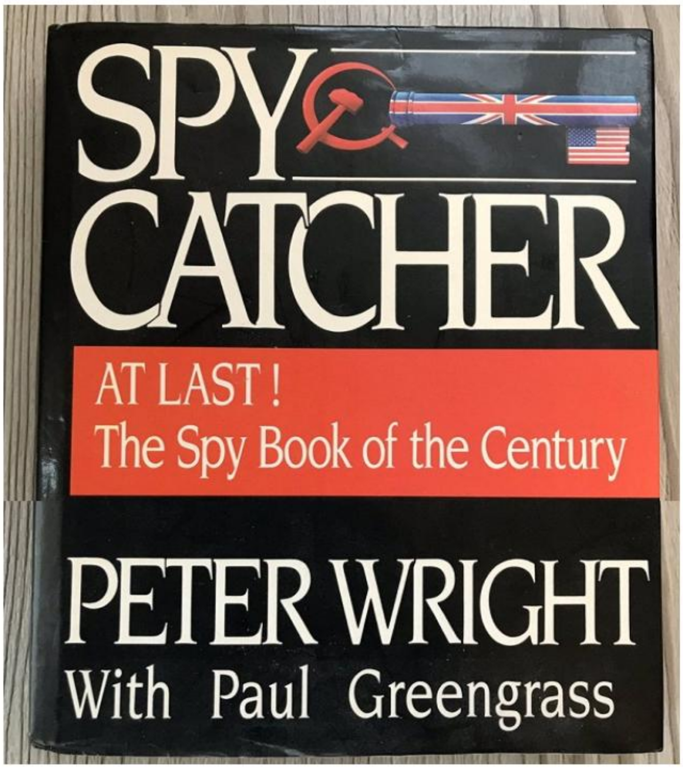

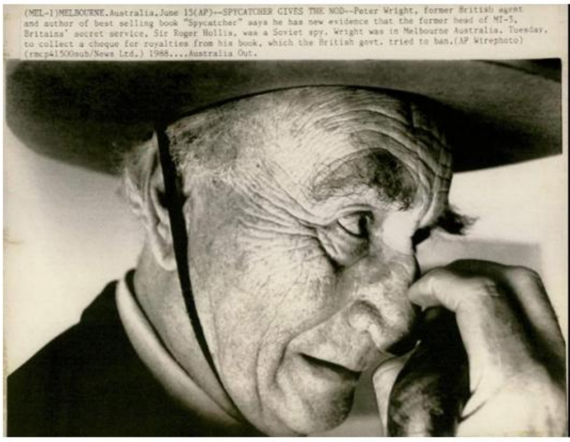

آسٹریلیا کے شہر تسمانیہ چلا گیا جہاں وہ گھوڑے پالنے لگا، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن اس کے دوست وکٹر راتھ شیلڈ نے اسے فوری لندن پہنچنے کو کہا، دراصل راتھ شیلڈ پر کیمونسٹ رابطوں کا شک کیا جا رہا تھا اور وہ پیٹر کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے بلا رہا تھا۔ پیٹر لندن، آ گیا، اسی دوران اس کا تعارف Chapman Pincher سے ہوا، جس نے پیٹر رائیٹ کو راضی کر لیا کہ وہ MI 5 کے کچھ راز اسے بتائے اور اس کے عوض اسے معقول معاوضہ دینے کی پیش کش کی۔ پیٹر رائیٹ پہلے ہی MI 5 سے بھرا بیٹھا تھا، اس نے کچھ معلومات Pincher کے حوالے کر دیں اور یوں 1981ء میں Pincher کی کتاب Their trade is treachery شائع ہوئی۔ اس کتاب میں یہ تہلکہ خیز انکشاف تھا کہ برطانوی سیکرٹ سروس MI 5 کا ڈائریکٹر جنرل Roger Hollis دراصل روسی ایجنٹ تھا اور MI 5 کی خفیہ ترین معلومات KGB تک پہنچاتا تھا، لیکن یہ صرف معلومات کا ایک حصہ تھا۔

معلومات کا بیشتر حصہ پیٹر رائیٹ کے سینے میں محفوظ تھا جو آسٹریلیا کے شہر تسمانیہ میں اپنی ریٹائرڈ زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ تب ایک صحافی Pual Greengrass نے پیٹر رائیٹ کو اپنی یادداشتیں لکھنے پر رضامند کر لیا۔ گرین گراس کی برطانوی سراغ رساں ایجنسی کے حوالے سے اپنی تحقیق اور تجربے اور پیٹر رائیٹ کے سنسنی خیز انکشافات نے SpyCatcher کی تخلیق میں مدد دی۔ کتاب کو آسٹریلیا سے شائع کیا گیا۔ اس کتاب میں پیٹر رائیٹ نے تفصیل سے بتایا کہ کیسے اسے اس بات کا مکمل یقین ہے کہ MI 5 کا سربراہ Roger Hollis خود روسی ایجنٹ تھا اور اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے پیٹر نے کتنے ہی شواہد اکٹھے کیے تھے، لیکن آخر میں پیٹر کو مایوسی ہوئی کہ Roger Hollis پر روسی ایجنٹ ہونے کا الزام ثابت نہ ہو سکا۔ پیٹر نے اپنی کتاب میں انکشاف کیا کہ MI 5 کی ساری سرگرمیوں کی مانیٹرنگ روسی سراغ رساں ایجنسی کامیابی سے کر رہی تھی، کیونکہ ایجنسی کے اندر ان کا کوئی ایجنٹ کام کر رہا تھا۔ کتاب میں یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ نہر سویز کا مسئلہ جب عروج پر تھا تو مصری سفارت خانے میں MI 5 نے جاسوسی کے آلات کیسے نصب کیے تھے، کتاب میں یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ برطانوی وزیراعظم ہرالڈ ولسن کے روس کے ساتھ خفیہ رابطے تھے اور MI 5 نے باضابطہ طور پر ولسن کے خلاف مہم چلائی۔ یاد رہے ہرالڈ ولسن 1964-1970ء تک برطانیہ کا وزیراعظم رہا اور پھر دوبارہ 1974-1976ء میں وہ اقتدار میں آ گیا، یہ وہی سال تھا جب پیٹر ریٹائر ہو رہا تھا۔ ولسن کو معلوم تھا کہ اس کے خلاف سازش میں پیٹر کا کردار بھی تھا، یہی وجہ ہے کہ پیٹر کو پنشن کی مراعات سے محروم ہونا پڑا۔ 1987ء میں جب آسٹریلیا میں SpyCatcher شائع ہوئی تو برطانیہ میں مارگریٹ تھیچر کی حکومت تھی، اس نے برطانیہ میں کتاب کی اشاعت پر پابندی لگا دی لیکن کتاب سکاٹ لینڈ اور آسٹریلیا سے سمگل ہو کر دھڑا دھڑ بک رہی تھی۔ تھیچر کی حکومت نے آسٹریلیا کی عدالت میں کتاب شائع کرنے پر پابندی کی درخواست دی، یہ ایک تاریخی مقدمہ تھا جس میں برطانوی سیکرٹری رابرٹ آرمسٹرانگ خود سڈنی کی عدالت میں گئے جہاں کتاب کے پبلشر کے وکیل کی جرح کے سامنے برطانوی سیکرٹری ڈھیر ہو گئے اور عدالت نے پبلشر کے حق میں فیصلہ دیا اور برطانوی حکومت کو حکم دیا کہ وہ مقدمے کے اخراجات پبلشر اور پیٹر رائیٹ کو ادا کرے۔ 1988ء میں برطانیہ میں بھی کتاب کی اشاعت کی اجازت اس بنیاد پر دے دی گئی کہ اب اس کتاب کے راز راز نہیں رہے، لیکن تھیچر کی حکومت نے عدالت کو درخواست دی کہ پیٹر کو کتاب کی رائلٹی بند کی جائے، جسے عدالت نے مان لیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کتاب کی بیس لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں، یوں پیٹر رائیٹ، جسے پنشن سے محروم کر دیا گیا تھا، یکایک دنیا کی اہم ترین شخصیت بن گیا۔ کتاب سے ملنے والی آمدنی نے اسے کروڑ پتی بنا دیا تھا، ایک عام سے گھرانے میں جنم لینے والا پیٹر، جس کی تعلیم واجبی سی تھی، نے اپنی محنت اور لگن سے MI 5 میں اپنا مقام پیدا کیا اور جب وہ 1995ء میں اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کا شمار کروڑ پتی رؤسا میں ہوتا تھا۔ میں اپنے سامنے رکھی ہوئی کتاب کو دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیسے کچھ کتابیں پڑھنے والوں کی زندگیاں بدل دیتی ہیں اور بعض کتابیں لکھنے والوں کی زندگیوں میں انقلاب لے آتی ہیں۔

بشکریہ روزنامہ دنیا۔

کیا مستقبل میں بوسہ لینا، مصافحہ کرنا یا بغل گیر ہونا معیوب سمجھا جائے گا؟

کسی بھی عام ہفتے میں ہمارے لیے یہ گننا مشکل ہوتا ہے کہ ہم کتنی بار دوسرے انسانوں سے جسمانی رابطے میں آئے۔ بہت سارے افراد کے لیے جو کووڈ 19 کے دور میں علیحدہ اور تنہا رہ رہے ہیں، یہ ان کی زندگی کا طویل ترین عرصہ ہوسکتا ہے جس میں وہ اتنے دنوں تک کسی انسان سے لمسی رابطے کے بغیر رہے ہوں۔ ہم ان دنوں انسانوں کے درمیان جو انتہائی فاصلے دیکھ رہے ہیں امید کہ وہ ایک غیر مستقل تبدیلی ہو۔ لیکن چونکہ اب زیادہ تر ممالک اپنے لاک ڈاؤن کو ختم کر رہے ہیں تو ہمارے سامنے یہ پریشانی ہے کہ ہم عام زندگی کی طرف کس طرح لوٹیں اور کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملیں جلیں کہ ہم محفوظ بھی رہیں اور کسی کے جذبات کو ٹھیس بھی نہیں پہنچائیں۔ کئی مہینوں سے ہم سماجی دوری قائم رکھنے کی مشق کر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے کم سے کم دو میٹر دور رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ ہم عوامی مقامات پر سطحوں اور چیزوں کو چھونے اور کھانسنے اور چھینکنے سے گریز کر رہے ہیں۔ شائستگی اور محبت کے جذبات کے مظہر زندگی بھر کے سیکھے گئے معاشرتی اصولوں کے تجربے کو ختم کرنا مشکل رہا ہے: بہت ساری ثقافتوں میں جب ہم نئے لوگوں کا استقبال کرتے ہیں تو ان سے مصافحہ کرتے ہیں، جن سے بہت قریب ہوتے ہیں ان سے بغل گیر ہوتے ہیں اور جس کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے حقیقی معنوں میں ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ اب ہم ایک بار پھر باہر جانے کی تیاری کر رہے ہیں جہاں ان تمام عادات کو روکنا پڑسکتا ہے! فرانسیسیوں کا ہوائی بوسہ مرض کے پھیلنے کا سبب ہوسکتا ہے۔ اطالویوں کا پرجوش خیر مقدم ممکنہ طور پر زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے۔ اب چھونے والے طور طریقے شاید قابل قبول نہ ہوں اور اس کے ساتھ ہم نے جو جسمانی رابطے کے طور طریقے سیکھے ہیں ان میں بھی تبدیلی رونما ہوسکتی ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ارتقائی نفسیات کے پروفیسر رابن ڈنبار کہتے ہیں کہ یہ سب مشکل ہوگا۔ ان کے مطابق 'جسمانی لمس اس طریقہ کار کا ایک حصہ ہے جسے ہم اپنے تعلقات، دوستی اور خاندانی رشتے قائم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔' یہ سب پرائمیٹس کی حیثیت سے ہماری قدیم تاریخ کا حصہ ہے جس میں کھال کو چھیڑنے سے ہمارے دماغ میں اینڈورفن سسٹم متحرک ہوتا ہے

اور جس کی وجہ سے ہم میں گرم جوش اور مثبت احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب ہم نئے معمول کو اپنانے کی کوشش کریں گے تو ہوسکتا ہے کہ اس سے ہمارے اندر الجھن اور تشویش پیدا ہو۔ مانچسٹر بزنس سکول میں آرگنائزیشنل سائیکالوجی اور صحت کے پروفیسر کیری کوپر کا کہنا ہے کہ 'لمسی طور پر چھونے یا لوگوں کے کانوں میں پھسپھسانے جیسی چیزیں تھوڑے عرصے کے لیے غائب ہو جائیں گی اور اس کے نتیجے میں کمیونیکیشن قدرے پیچیدہ ہو جائے گی۔ لوگ چیزوں کی غلط تشریح کرسکتے ہیں کیونکہ آپ کے پاس سمجھانے کے لیے اشارے نہیں ہوں گے۔'

تاہم ہم پہلے ہی ایسے طریقوں پر غور کر رہے ہیں جس میں ہم اس نئی دنیا میں کام کرسکتے ہیں اور لاک ڈاؤن کے دوران ہم ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے بہت کچھ سیکھ رہے ہیں۔ دنیا بھر کے شوز میں یہ نظر آرہا ہے کہ شو کے میزبان ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر بیٹھے ہوئے اور دور رہنے کی اہمیت کو اجاگر کر رہے ہیں۔ پورٹس متھ یونیورسٹی کی ایریکا ہیوز کا کہنا ہے کہ 'ہر کوئی حقیقت میں ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود ایک ساتھ ہونے کا تصور پیش کر رہا ہے۔'

ہم سب سے زیادہ تبدیلی مصافحہ کرنے کے معاملے میں دیکھ سکتے ہیں کیونکہ بہت سی شہ سرخیوں میں اس کے وجود پر سوال اٹھایا جارہا ہے

اس کے برعکس جب ہم سماجی دوری سے پہلے کے تیار کردہ پروگرام دیکھتے ہیں تو ہمیں اس تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ شراب خانے، نائٹ کلبوں اور شاپنگ سنٹرز میں نظر آنے والے ہجوم کے مناظر دیکھتے ہی ہمیں ایک جھٹکا لگتا ہے اور عجیب و غریب ردعمل سامنے آتا ہے جو اس بات کا غماز ہے کہ ہمارا دماغ سماجی دوری کو قبول کرنے کے لیے تیار ہورہا ہے اور اس کی نئی وائرنگ ہو رہی ہے۔ یہ ایک ایسی وسیع تر پریشانی کی عکاسی کرتا ہے جو معاشرتی رابطے میں واپسی کے خطرات کے بارے میں پوری دنیا میں پائی جاتی ہے۔ رائے عامہ کی ایک تحقیق کے مطابق صرف سات فیصد برطانوی وائرس مکمل طور پر نہ ختم ہونے کی صورت میں بھی بند کاروبار کو دوبارہ کھولنا چاہتے ہیں جبکہ 70 فیصد نے سختی سے معمول پر واپس جانے کی مخالفت کی ہے۔ 60 فیصد آسٹریلوی اور امریکی، کینیڈا کے 70 فیصد لو※گ، فرانس اور برازیل کے 50 فیصد لوگ اور 40 فیصد چینی اس وائرس سے نمٹنے تک معاشرے کو دوبارہ کھولنا نہیں چاہتے ہیں۔ ماہرِ نفسیات بھاونا جانی نیگاندھی کا کہنا ہے 'حالیہ وبا نے ہماری ہر چیز کو بدل دیا ہے، خاص طور پر اس بارے میں کہ ہم معاشرتی طور پر کیسے جڑے رہ سکتے ہیں۔' انھوں نے مزید کہا کہ 'لوگوں نے اس چیلنج کو قبول کیا ہے اور تخلیقی طریقوں سے معاشرتی روابط کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ مختلف رہا اور نئے سماجی طور طریقوں کو اپنانا مشکل ہوسکتا ہے۔' اب زندگی میں آنے والی بہت ساری تبدیلیوں کو 'بے مثال' کہا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر فرانس کے وزیر صحت نے کووڈ 19 کی وجہ سے شہریوں کو بوسہ لینے سے باز رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن ہم پہلے بھی ایسی چیزیں دیکھ چکے ہیں۔ اس سے قبل 15 ویں صدی میں انگلینڈ میں بادشاہ ہنری ششم نے بوبونک طاعون کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے بوسہ لینے پر پابندی عائد کردی تھی۔ انفیکشن کا شکار کسی قریبی شخص سے بے رخی کا تاریک پہلو بھی ہوسکتا ہے۔ جب ایچ آئی وی یا ایڈز پہلی بار سامنے آیا اور جس میں اس کے مثبت نتائج سامنے آئے ان کو بدنامی کے داغ کے طور پر دیکھا گیا۔ بہت سے لوگوں کو خدشہ تھا کہ اگر وہ ایچ آئی وی یا ایڈز کے مریض سے ہاتھ ملائیں گے تو انھیں بھی یہ بیماری لگ سکتی ہے حالانکہ اس بات کے مکمل شواہد تھے کہ یہ انفیکشن جنسی طور پر منتقل ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں شہزادی ڈیانا نے سنہ 1987 میں لندن کے مڈل سیکس ہسپتال میں ایچ آئی وی یا ایڈز کے لیے زیر علاج ایک مریض سے مصافحہ کیا تھا تاکہ اس بدنامی کے داغ سے نمٹا جاسکے۔ اسی طرح ٹی بی یا تپ دق کے مریضوں کے ساتھ دنیا بھر میں مختلف سلوک روا رہے ہیں جس میں ان سے زیادہ سے زیادہ دوری بنانا بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ جذام کے مرض والوں کو سماج سے باہر کیے جانے کی لمبی تاریخ رہی ہے لیکن وقت گزرنے ساتھ اور غلط باتیں پھیلانے والوں کے کے خلاف مہم کے نتیجے میں رویوں میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جیسے اب بہت سے لوگ کسی ایچ آئی وی پازیٹو کو گلے لگانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اگر کورونا وائرس کی متوقع ویکسین سامنے آتی ہے اور ہمارے فوری گھریلو 'ماحول' سے باہر کے لوگوں کے ساتھ جسمانی رابطے محفوظ ہو جاتے ہیں تو ہمارے نئے رویے کتنے دیرپا رہیں گے؟

شہزادی ڈیانا نے ۱۹۸۷ میں لندن کے مڈل سیکس ہسپتال میں ایچ آئی وی یا ایڈز کے لیے زیر علاج ایک مریض سے مصافحہ کیا تھا

ڈنبار کہتے ہیں 'مجھے شبہ ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی تبدیلی آئے گی لیکن وقت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوجائے گا' ابتدائی خوف اور قریبی ذاتی رابطے سے تنفر ممکنہ طور پر ان طریقوں کی جگہ لے گا جو ہم نے پیدائش کے بعد سے ہی اپنایا ہے۔ ہم سب سے زیادہ تبدیلی مصافحہ کرنے کے معاملے میں دیکھ سکتے ہیں کیونکہ بہت سی شہ سرخیوں میں اس کے وجود پر سوال اٹھایا جا رہا ہے۔ لیکن ڈبر کا کہنا ہے کہ ابھی یہ قبل از وقت ہوسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'یہ ہم میں اس طرح سرایت کر چکے ہیں، لوگوں کا مصافحے کے لیے

ہاتھ نہ بڑھانا مشکل ہوگا۔اس سے کو پر بھی متفق ہیں۔ وہ کہتے ہیں 'مجھے مستقبل قریب میں مصافحہ کا متبادل نظر نہیں آتا ہے۔ بہت سے مختلف طریقے اپنائے گئے ہیں جن میں پاؤں کا چھونا اور کہنی ٹکرانا، لیکن چونکہ یہ کرنا خلاف فطرت ہے اس لیے یہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا ہے۔اگر خوش آمدید کہنے کے کم رابطے والے طریقے اپنائے جاتے ہیں تو بھی جو ہم کھو رہے ہیں اس کا غم کم نہیں ہو سکے گا۔ہیوز کے لیے یہ مشکل رہا ہے کہ جب وہ گروسری کی خریداری کر رہی ہوتی ہیں اور کوئی شناسا ان کو نظر آجائے تو وہ اس کے پاس جا کر اس سے نہ ملنے کی اپنی خواہش کو نہیں دبا پاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں 'اس حد کو عبور نہ کر پانا ہمیشہ تکلیف دہ ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا ہے۔' اگرچہ وہ اسے کسی دوست کو کھونے کے غم کے مترادف تو نہیں مانتیں لیکن اسے تعلق کے درمیان کسی اہم چیز کے کھونے جیسا کہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں 'میرے خیال سے ہم اس احساس کو کھو رہے ہے کہ جب آپ قدرتی طور پر کسی کو گلے لگنا چاہتے تو اس وقت کیا کریں۔' اور نامعلوم کا خوف یعنی پوشیدہ خطرہ ہمیں ان پریشان کن جذبات کا احساس دلاتا رہے گا۔جانی نیگاندھی کا کہنا ہے کہ 'ہم اس وبائی مرض کے اپنے تجربے اور انفرادی طور پر اس کے اثرات کے زیر اثر دوسروں کے ساتھ اپنے میل جول کے طریقے میں تبدیلی لا سکتے ہیں اور محتاط انداز اختیار کر سکتے ہیں۔لیکن اس سے پہلے کہ ہم احساس زیاں کا ماتم کریں یہ سوچنا اہمیت کا حامل ہے کہ ہم اس سے کیا حاصل کر سکتے ہیں۔شاید پہلا بوسہ زیادہ پر اثر احساس ہوگا کیونکہ اس کی اپنی نئی اہمیت ہوگی۔ ہوائی جہاز جو منافع کمانے کے لیے کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں وہ زیادہ قابل برداشت ہوں جب جگہ کے متعلق نئے قواعد رقم کیے جائیں۔کس کو کندھے دینے کے لیے بغل گیر ہونا زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا جب آپ یہ سوچیں گے کہ آپ کس سے بغل گیر ہو رہے ہیں اور اس طرح کسی کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھنے کی اہمیت زیادہ ہوگی۔ہیوز ایک ایسے مستقبل کی پیش گوئی کرتی ہیں جس میں ہم اپنے سماجی گروہوں کو کئی دائروں میں منقسم کریں گے۔اس میں ایک

لمسی طور پر چھونے یا لوگوں کے کانوں میں پھسپھسانے جیسی چیزیں تھوڑے عرصے کے لیے غائب ہو جائیں گی

اندرونی دائرہ ہوگا جس میں وہ لوگ ہوں گے جنھیں ہم چھونے کو تیار ہیں اور ایک بیرونی حلقہ ہے جس کے متعلق ہم محتاط ہوں گے۔ وہ کہتی ہیں 'جب آپ کو کسی کو چھونا پڑے تو آپ کو اس کی قدر ہوگی۔مغربی معاشرے میں جو کچھ ہے وہ اس سے بڑھ جائے گا اور واضح طور پر یہاں جو علیک سلیک ہے اس کی مزید تصدیق ہو جائے گی۔'

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ تبدیلی بہت آسان ہوں گی۔ ہیوجز کا کہنا ہے کہ 'یہ دل دوز ہوگا۔ بہت ساری ثقافتوں کے پاس رابطے کے واقعی خوبصورت طریقے ہیں جن میں چھونے جیسی چیز شامل نہیں ہے۔لیکن گلے لگانے یا گالوں کے بوسے جیسی بڑی چیز کو بدلنے کے لیے میرے خیال میں ایک نئی کوریوگرافی کی ضرورت ہوگی۔' ہیوز جو جنوبی امریکہ سے تعلق رکھتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ ملنے کے متبادل طریقے ہمارے یہاں موجود ہیں۔ وہ جب اپنے والدین سے ملنے کے لیے اپنے گاؤں گاڑی چلا کر کے جاتی ہیں تو لوگ راستے میں ہاتھ اور سر ہلاتے نظر آتے ہیں اور انھیں ایسا لگتا ہے ان کا گھر خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ شاید آپ کو کار سے باہر نکالنا پڑے۔' جسمانی رابطے کی کمی کے بارے میں پریشان ہونے والوں کے لیے ڈنبر کے پاس چند امید افزا الفاظ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 'چھونا جسمانی تعلق کے اظہار کا واحد طریقہ نہیں ہے۔ ہمارے پرائمیٹ آبا کے ارتقا نے ہمیں دوسروں کے ساتھ تعلق محسوس کرنے کے اور بھی نئے طریقے بتائے ہیں جو اینڈورفنس کو متحرک کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں ہنسی، گانا، ناچنا، کہانیاں سنانا، مذہبی رسومات وغیرہ جیسی چیزیں ہیں۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جو ہم اپنی روزمرہ معاشرتی زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔' لہٰذا اگر ہم ابھی کچھ وقت تک جسمانی رابطے کے متعلق محتاط رہیں لیکن جسمانی طور پر دور رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم قریب محسوس نہیں کر سکتے ہیں۔

(بشکریہ بی بی سی اُردو)

چندلوگ سائنس کو سنجیدگی سے لیتے ہیں

تحریر: پرویز ہود بھائی

جب صوبہ ووہان میں اچانک کرونا وائرس نمودار ہوا تو گھبرائے ہوئے چینی حکام نے اس وبا سے نپٹنے کے لیے انتہائی برے انداز میں اقدامات کیے، جس کے نتیجے میں انہیں بین الاقوامی سطح پر کڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم خود کی اصلاح کی بدولت جلد ہی انہیں ایک منظم، جامع اور مربوط ردعمل ملا۔ سرعت رفتاری سے چین نے کرونا متاثرین کے بڑھتے ہوئے گراف کو ہموار کر دیا اور (امریکہ کے علاوہ) ہر طرف سے داد و تحسین وصول کی۔ چین اس وقت ہزاروں وینٹی لیٹر اور لاکھوں ماسک دوسرے ممالک کو بھیج کر وبائی امراض کا مقابلہ کرنے والے عالمی رہنما کی حیثیت سے اپنے تشخص کو دوبارہ سے ٹھیک کر رہا ہے۔

چین اس لیے کامیاب ہوا کیوں کہ اس نے سائنس کو بہت سنجیدگی سے لیا ہے۔ جب اس کے وبائی امراض کے ماہرین نے ٹائی ٹینک کو آئس برگ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے دیکھا (یعنی وائرس کو تیزی سے پھیلتے ہوئے پایا) تو انہوں نے انتہائی سخت اقدامات اٹھانے کا مطالبہ کیا۔

سائنسی ثقافت میں پروان چڑھنے والی چینی حکومت نے ان ماہرین کی رائے سے اتفاق کیا اور جلد ہی موجودہ دنیا کی عالمی تاریخ میں سب سے بڑی تحریک کا آغاز کر دیا۔ ملک میں قرنطینہ نافذ کیا، بیسیوں عارضی ہسپتال قائم کیے اور اس وائرس سے متاثر ہو سکنے والے افراد کو انتہائی احتیاط سے تلاش کر کے چین نے ثابت کر دیا کہ منظم، عقلی اور اجتماعی کوششوں سے کیسے ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ امریکہ (بلاشبہ دنیا کا سب سے زیادہ سائنسی لحاظ سے ترقی یافتہ ملک ہے) اس سے بھی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ تقریباً ہر ایک چینی شہری کے مقابلے میں اٹھارہ امریکی لوگوں کی موت ہو چکی ہے، اس لیے امریکہ کو ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن تاریخ کے ایک حیرت انگیز واقعے نے دائیں بازو کی جماعت کے غیر سائنسی شخص کو امریکہ کا سربراہ مقرر کر دیا ہے۔ اس شخص نے اپنے ملک کے سینئر ترین ماہر وبائی امراض کو ڈانٹا اور ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے فنڈ کاٹ لیے اور امریکہ کو اپنا لاک ڈاؤن ختم کرنے کا حکم جاری کیا۔ ٹرمپ کی منظوری کی درجہ بندی اب بھی پچاس فیصد کے لگ بھگ رہتی ہے۔ یہ امر اس قوم کے لیے افسوسناک ہے جس کی پوری دنیا نے کبھی تعریف کی تھی، لیکن اب اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ تاہم اس کے مسائل ابھی مزید بدتر ہو سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے امریکیوں کو بخوبی احساس تھا کہ وہ کسی پاگل شخص کے احمقانہ نسخے نہ خریدیں (چاہے وہ شخص ان کا صدر ہی کیوں نہ ہو) اور خود کو وائرس سے بچانے کے لیے لیسول (Lysol) یا ڈیٹول کے انجکشن نہ لگائیں۔ اس معاشرے میں ماسک ابھی بھی لازمی عنصر کے طور پر پہنا جا رہا ہے، اگرچہ کہ سماجی فاصلہ پر عمل درآمد اب تھوڑا سا کم ہو گیا ہے۔

عام امریکی شہری جزوی طور پر ٹرمپ پر قابو پا رہے ہیں، کیونکہ عام چینی شہریوں کی طرح ان کی پرورش بھی عقلیت کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ انجیل کی بشارت کو ایک طرف رکھ کر سبھی امریکی یہ قبول کرتے ہیں کہ بیماری وائرس اور بیکٹریا سے ہوتی ہے خدا کے قہر سے نہیں۔ ہائی اسکول جانے والے تمام لوگوں نے وہاں کم از کم کچھ چیزیں تو سیکھی ہی ہوں گی، آخر کار تعلیم اپنا اثر رکھتی ہے۔

پاکستان کی قیادت اور عوام کا کیا حال ہے؟ ذہن میں آنے والی ایک تصویر یہ ہے کہ وزیراعظم عمران خان فنڈ جمع کرنے کی مہم میں مولانا طارق جمیل کو عقیدت سے سن رہے ہیں اور مولانا دل سوز انداز میں آہ و زاری کرتے ہوئے آسمان والے سے معافی مانگ رہے ہیں اور کم لباس والی عورتوں کو عذاب الٰہی کو دعوت دینے کا سبب قرار دے رہے ہیں۔ ایک دوسرا تصور ذہن میں یہ آتا ہے کہ (اگرچہ یہ بڑھاپے کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے) خان صاحب نے ٹرمپ کی پیروی کرتے ہوئے ماسک پہننے سے انکار کر دیا، تاکہ کسی بھی طرح ان کی کشش میں کمی نہیں آئے۔ جس کی بدولت ان کے مستقل مزاج قسم کے پیروکار کہتے ہیں کہ یہ بدمعاش وائرس کسی ایسے بہادر آدمی کو کچھ نہیں کہہ سکتا جو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہو۔

جب یہی حکمران مذہبی طاقتوں سے صف آرا ہوتے ہیں تو تمام تر بہادری اڑ جاتی ہے۔ اس شبہ میں کہ حکومت مساجد اور مزارات کو بند کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے تو سنی اور شیعہ علما کرام مشترکہ طور پر (جن کا اتحاد خال خال ہی ممکن ہوتا ہے)

حکومت کو سخت تنبیہ کرتے ہیں۔ جس کے ردعمل میں صدر عارف علوی اعلان کرتے ہیں کہ حکومت اور علمائے کرام کے اتفاق رائے سے طے شدہ بیس شرائط کے تحت مساجد کو کھولا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ ابھی اس معاہدے کی سیاہی گیلی ہی تھی جب ملک کی اسی فیصد مساجد میں صریح خلاف ورزی کی اطلاعات ملی۔

اس کے بعد سیلاب کو روکنے والے بند بہہ گئے۔ ایک مختلف وقفے کے بعد اب عوامی مقامات پر ماسک اور دستانے کے بغیر لوگ گھوم پھر رہے ہیں اور انہوں نے کمال لاپرواہی سے سب کچھ تقدیر اور حالات پر چھوڑ دیا ہے۔ اب کھانے، جوتوں اور کپڑے کی مارکیٹیں لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہیں۔ حتیٰ کہ کووڈ 19 کی وجہ سے اموات میں اضافہ ہو رہا ہے، لیکن تعلیمی اداروں جیسی جگہوں کے کے علاوہ ہر جگہ زندگی معمول پر آ رہی ہے۔ تعلیمی اداروں میں تعلیم کا عمل اس لیے بند ہے کیونکہ یہ ہماری کم ترین ترجیحات میں شامل ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اعداد و شمار کے مطابق نوجوان افراد کووڈ 19 سے کم متاثر ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی پنجاب میں تمام اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں پندرہ جولائی تک بند ہیں۔

عام پاکستانی کو کون سی چیز مذہبی طور پر جنونی بناتی ہے اور باقی ملکوں کے مسلمانوں کے برعکس انہیں سنبھالنا مشکل کیوں ہے؟ سعودی عرب آئندہ عیدالفطر کے موقع پر ملک بھر میں پانچ روزہ چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، جبکہ ایران کے وزیر داخلہ کا کہنا ہے کہ حکومت ابھی بھی اس بات پر بحث کر رہی ہے کہ اس دن مکمل لاک ڈاؤن نافذ کیا جائے۔

لیکن اجتماعی نمازوں پر پابندی لگانا اور دوسرے مسلم ممالک کے اقدامات پر عمل کرنا پاکستان کے لیے ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ اگر حکومت نے یہ فیصلہ کرنا تھا تو عام پولیس اور ماتحت سپاہیوں نے احکامات کی نافرمانی کر دینی تھی۔ نائن الیون کے بعد طالبان کے خلاف مہم چلانے کے تلخ تجربات ابھی تک ملٹری اسٹبلشمنٹ کے ذہنوں سے بمشکل مٹے ہیں۔

لہذا صدر علوی کے پاس اپنی عزت بچانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ آدھے سے زیادہ شہریوں، فوج کی اکثریت یا مکمل فوج اور حکومت میں سے کسی کی بھی بات ہو، لال مسجد کے مولانا عبدالعزیز جیسے ملاؤں کو منانا ہی پڑتا ہے، کیونکہ ان کا ہاتھ عوام کی نبض پر ہوتا ہے۔ اس لیے ریاست محاذ آرائی کی بجائے باہمی تعاون کی راہ کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن اس عمل کو بجا طور پر کمزوری سمجھا جاتا ہے۔

کیا یہ مسئلہ مزید تعلیم حاصل کرنے سے حل ہو سکتا ہے؟ اکثر یہ سننے میں آتا ہے کہ تعلیم کو وسعت دینے سے عقلی نقطہ نظر پیدا ہو جائے گا اور پاکستان کو ترکی، ملائیشیا یا مراکش جیسے باشعور ممالک کے قریب لایا جائے گا۔ لیکن اگر تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ جو تدریسی مواد پڑھایا جا رہا ہے وہی پڑھانا ہے تو اس تعلیم سے کوئی تبدیلی آنا ممکن نہیں۔

عقلیت پسندی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے قومی نعرے یقین، اتحاد اور نظم و ضبط کی ایک مخصوص رنگ ڈھنگ سے کی گئی تعریف (ایمان، اتحاد، تنظیم) ہے، جو ضیا الحق کے دور میں رائج ہوئی اور اس کے بعد سے اب تک غالب ہے۔ صرف اور صرف عقیدہ کے ذریعہ قومی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کر کے جو ہم نے قیمت ادا کی ہے وہ پاکستانی معاشرے میں عقلیت کے خد و خال اور دنیاوی اداروں پر یقین کا خاتمہ ہے۔ جس کے نتیجے میں گورننس کم ہو گئی۔ اس لیے عوام انسان کے بنائے ہوئے تمام ریاستی قوانین کو اعلیٰ اتھارٹی کے زیر نگرانی بنے ہوئے قواعد و ضوابط مانتی ہے۔

یہ ذہنیت زندگی کے ہر گوشے پر چھا رہی ہے۔ ان حالات میں تعلیم کی اصلاح اور ایک تنقیدی ذہنیت پیدا کرنا انتہائی مشکل عمل بن جاتا ہے۔ سائنس کے میدان میں ترقی (سائنسی فکر کے بغیر) بڑی بڑی رقوم لگانے کے باوجود نہیں ہوتی ہے۔ پاکستانی عوام بم، مشین اور دوائیں بنانے میں سائنس کی افادیت پر اعتراض نہیں کرتے ہیں، لیکن ثقافتی طور پر سائنسی فکر کہیں بھی نظر نہیں آتی ہے۔ اسکول میں سائنسی مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے چند ایک طلبا ہی سائنسی فکر سے روشناس ہوتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا ہے کہ سائنس اور عقلیت پسندی کے ساتھ توہین آمیز رویہ رکھنے کے سبب ہمیں کووڈ 19 کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ وبائی امراض اور وائرالوجی کے میدان میں طبعیات کی سی درستگی کا فقدان ہے، لہذا ہمارے بہترین ماہرین صرف اندازہ لگانے اور حکمت عملی طے کرنے کے بارے میں مشورہ دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں چونکہ سائنس کو کم سمجھا جاتا ہے اور اس کی قدر و منزلت بھی زیادہ نہیں ہے، اس لیے ان ماہرین کی ہدایات پر کوئی بھی عمل نہیں کرتا ہے۔ اگر قسمت اچھی ہوئی تو پاکستان میں اموات کی حتمی تعداد چند ہزار تک محدود رہے گی۔ جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ اس جہاز کا عملہ اور کپتان اسے سامنے موجود برفانی تودے سے دور ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

شعبہ شعروشاعر

تحریر: افتخار عارف

فضا میں وحشت سنگ و سناں کے ہوتے ہوئے

فضا میں وحشت سنگ و سناں کے ہوتے ہوئے
قلم ہے رقص میں آشوب جاں کے ہوتے ہوئے

ہمیں میں رہتے ہیں وہ لوگ بھی کہ جن کے سبب
زمیں بلند ہوئی آسماں کے ہوتے ہوئے

بضد ہے دل کہ نئے راستے نکالے جائیں
نشان رہگزر رفتگاں کے ہوتے ہوئے

جہان خیر میں اک حجرۂ قناعت و صبر
خدا کرے کہ رہے جسم و جاں کے ہوتے ہوئے

قدم قدم پہ دل خوش گماں نے کھائی مات
روش روش نگہ مہرباں کے ہوتے ہوئے

میں ایک سلسلۂ آتشیں میں بیعت تھا
سو خاک ہو گیا نام و نشاں کے ہوتے ہوئے

میں چپ رہا کہ وضاحت سے بات بڑھ جاتی
ہزار شیوۂ حسن بیاں کے ہوتے ہوئے

الجھ رہی تھی ہواؤں سے ایک کشتیٔ حرف
پڑی ہے ریت پہ آب رواں کے ہوتے ہوئے

بس ایک خواب کی صورت کہیں ہے گھر میرا
مکاں کے ہوتے ہوئے لا مکاں کے ہوتے ہوئے

دعا کو ہات اٹھاتے ہوئے لرزتا ہوں
کبھی دعا نہیں مانگی تھی ماں کے ہوتے ہوئے

❁❁❁

شعبہ شعروشاعر

تحریر: ابن انشا

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ کچھ نہ کہو خاموش رہو

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ کچھ نہ کہو خاموش رہو
اے لوگو خاموش رہو ہاں اے لوگو خاموش رہو

سچ اچھا پر اس کے جلو میں زہر کا ہے اک پیالہ بھی
پاگل ہو کیوں ناحق کو سقراط بنو خاموش رہو

ان کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے
سر آنکھوں پر سورج ہی کو گھومنے دو خاموش رہو

محبس میں کچھ حبس ہے اور زنجیر کا آہن چبھتا ہے
پھر سوچو ہاں پھر سوچو ہاں پھر سوچو خاموش رہو

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں من میں کیا کیا موسم ہیں
اس بگیا کے بھید نہ کھولو سیر کرو خاموش رہو

آنکھیں موند کنارے بیٹھو من کے رکھو بند کواڑ
انشاؔ جی لو دھاگا لو اور لب سی لو خاموش رہو

❁❁❁

میں چار جماعتاں کیہ پڑھیاں

تحریر: وارث شاہ

میں چار جماعتاں کیہ پڑھیاں
میں فتوے لاواں ہر اِک تے،
کدی بے عملاں تے،
کدی بے عقلاں تے،
کدی شاعری تے، کدی گاؤں تے،
کدی حسّن تے کدی روون تے
میں فتوے لاواں ہر اِک تے،

میں آپ مسیتی جاوں ناں
جے جاواں مَن ٹکاواں ناں
میں فتوے لاواں اوتھے وی
کدی وضو تے کدی نماز اُتے
کدی اُچی نیویں آواز اُتے
کدی مَنن یا نہ مَنن تے
ہتھ اُتے تھلے بنھن تے
میں فتوے لاواں ہر اِک تے

کدی کافر آکھاں مولویاں نوں
کدی فتوے لاواں ساریاں تے،
کدی ٹوپی تے کدی داڑھی تے
گل چنگی یاگل ماڑی تے
کدی شہیداں تے کدی مریاں تے
کدی مناوندے جمن ورھیاں تے
کدی جنگاں تے کدی جہاد اُتے
میں فتوے لاواں ہر اِک تے

کدی رسم آکھاں دین نوں
کدی دین آکھاں رسماں نوں
میں رَبّ، قرآن نوں من لیا
پر مَنیا چُکن قسماں نوں
کدی عیداں تے شبراتاں تے
کدی جاگن والیاں راتاں تے
کدی زیراں تے کدی زبراں تے
کدی مزاراں تے کدی قبراں تے
میں فتوے لاواں ہر اِک تے

میں سُنّی، وہابی، حنفی ہویا،
ہویا شافعی، ملکی، تے حنبلی
میں سب کچھ ہویا۔۔۔
پر ۔ ہویا ۔ نہ ۔ مسلماں
میں چار کتاباں جو پڑھیاں
اپنے علم دیاں لاواں تڑیاں
وِیلاہ میرے علم دا ٹھوٹھا جے
ہر فتویٰ میرا چُوٹھا جے
میں آپ تاں فرض نبھاواں ناں
دین دے نیڑے جاواں ناں!
پر کافر آکھاں ہر اِک نوں!
میں فتوے لاواں ہر اِک نوں

میں چار جماعتاں کیہ پڑھیاں
میں فتوے لاواں ہر اِک تے،

بند کلیوں میں افسانے مت ڈھونڈو

تحریر: نغمانہ حسیب

کھلنے دو کہ کہانی خوشبو کی طرح بکھر جائے گی۔

یہ 1998 کی بات ہے غالباً۔۔۔ جب باؤ صاحب کو ہماری ایک نظم پڑھ لینے کا اتفاق ہوا۔ باؤ صاحب کو میں آج بھی یاد کروں تو ان کی ممتاز مفتیانہ شخصیت یادداشت کے کونوں کھدروں میں محفوظ ہے۔ نجانے ان بے ربط جملوں کا ان کے دل پر کیا اثر ہوا کہ وہ میرے اس سوڈگری کے جذباتی ابال کو شہر کے ایک معروف شاعر کو پڑھوانے پر مصر ہو گئے۔ میں نے ان کے اس خیال کی بالکل بھی پذیرائی نہ کی اور ان کو واضح کرنے کی کوشش کی ہم شاعرہ واعرہ ہرگز بھی نہیں، کیونکہ یہ کوئی منظم قسم کی تحریریں نہیں اور نہ ہی زبان کے الف ب سے ہم واقف ہیں۔لیکن باؤ جی کو کون سمجھائے، ان کے ذہن میں یہ سما چکی تھی کہ مجھے شہر کے کچھ شاعروں سے ملوانا بہت ضروری ہے ہے نہ جانے ان کو وہ شاعری کی تضحیک کیوں اتنی بھا گئی۔۔۔ بہر حال کہنے لگے پتر تو دس بجے دن کے تیار رہیں، میں آ جاؤں گا، پھر ہم چلیں گے۔ میں سمجھ گئی کہ اب نہیں ٹلنا انہوں نے۔ خیر اگلے دن وہ وعدے کے مطابق دس بجے اپنی سائیکل پہ آن دھمکے۔ میں نے بڑے ترلے واسطے دیےلیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور آخر ہم دونوں ان شاعر حضرت کے مسکن کی طرف چل دیے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ باؤ جی سائیکل ہاتھ میں پکڑے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور ہم اپنی ہرے رنگ کی ڈائری تھامے، چارو ناچار ان کے ہم قدم تھے۔ ڈھکا کالونی کے بعد ریلوے لائن پار کر کے ایک بستی آئی اور چند گلیاں مڑنے تڑنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے دروازے پر جا پہنچے۔ کھٹکھٹانے پر کسی نے دروازہ کھولا۔ ذرا سامنے سیڑھیاں تھی، یہ چوبارہ تھا، اوپر جانے پر یہ سیدھا ایک بیٹھک نما کمرے میں کھلا جس میں کچھ کرسیاں پڑی تھیں جن میں سے ایک کرسی پر کوئی تقریباً 60 سے 70 کے درمیان کے بزرگ بیٹھے تھے سر بالوں سے خالی ہاتھ میں ایک عصا، دھوتی اور بنیان، مجھے نہ جانے کیوں گاندھی جی یاد آئے۔ سلام دعا کے بعد باؤ جی نے شیخی بگھاری اور حضرت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہاں جناب یہ ہماری پیاری بچی بہت نفیس لکھتی ہے، میں اس کو آپ کے پاس لایا ہوں تا کہ آپ اس کی رہنمائی فرمائیں۔ جناب شاعر نے مغرور لیکن بزرگانہ نظر ہم پر ڈالی اور بولے" ہاں بیٹا سناؤ کیا لکھتی ہو"؟ یقین کریں مارے خفت اور خوف کے پہلے تو ہم قطعی انکار کر بیٹھے کہ ہم کچھ لکھتے ہیں، میں نے ان کو بتایا کہ میں کوشش کر کے نہیں لکھتی، انکل بس یہ لکھا جاتا ہے اور ایسے الفاظ ذہن میں آتے ہیں، جو میں نے کبھی پڑھے بھی نہیں ہوتے۔ وہ سٹپٹائے اور عینک کے پیچھے سے باؤ جی کو گھور کے بولے،" باؤ جی آپ تو کہتے تھے بچی شاعری کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ نہیں کرتی اور یہ مسئلہ جو یہ بتا رہی ہے کہ لفظ کہیں پڑھے بھی نہیں ہوتے اور ذہن میں آ جاتے ہیں تو یہ تو کوئی ذہنی مسئلہ لگتا ہے باؤ جی شاعری ایسے تو نہیں ہوتی"۔ "جناب والا آپ ایک بار سنیں تو سہی" باؤ جی تیزی سے بولے اور میری ڈائری میرے ہاتھ سے جھپٹ کر لیتے ہوئے کھولی، کچھ صفحے الٹ پلٹ کر بولے،" لے بیٹا یہ سنا جناب جی کو" میں نے انتہائی بے بسی سے ڈائری پکڑی دل میں سوچ رہی تھی کہ کیوں باؤ جی کے ہتھے چڑھ گئی، ادھر جناب عالی انتہائی متوجہ تھے بولے،" جی بیٹا ارشاد" "جی انکل میرا نام ارشاد نہیں" میں نے انتہائی سعادت سے ان کو اپنا تعارف کروانا چاہا، لیکن باؤ جی اچانک پھٹ پڑے،" پتر تو سنا بس" میں نے حیرت سے باؤ جی کو دیکھا اور پھر اعلی حضرت کو جو یوں گم سم حیران پریشان باؤ جی کو دیکھ رہے تھے اپنا چھوٹا سا منہ کھول کر جیسے ابھی رو پڑیں گے۔ ہمیں اپنی غلطی کا اچانک احساس ہوا جسے چھپانے کو ہم جلدی سے اپنی ڈائری کی طرف متوجہ ہو گے۔ باؤ جی نے وہی نظم مجھے منتخب کر کے دی تھی جس پر کل وہ بہت دیر سر دھنتے رہے تھے۔ میں نے شروع کیا،" یا حسرت" ابھی یہ دو لفظ بولے ہی تھے کہ اعلی حضرت نے ٹوکا،" کیا کہا؟ یعنی یا حسرت۔۔۔" "جی جی جناب" اور میں نے دوبارہ شروع کیا،" یا حسرت" تو اعلی حضرت پہلے سے بھی زور سے بولے" یا حسرت کیوں؟ حسرت کسی کا نام ہے جس کو آپ نے مخاطب کر چھوڑا بالکل آغاز ہی میں"؟

۔۔اب ہم چپ اور دیکھیں بٹر بٹر۔" جی نہیں یہ کسی کا نام نہیں یہ تو ویسے ہی

بس" میں نے وضاحت دینے کی ناکام کوشش کی" حسرت کو ویسے ہی یا لگا دیا یہ کون سا اصول ہے اردو زبان کا بھئی؟ باؤ جی آپ تو کہتے تھے بچی شاعری کرتی ہے"؟ بیچارے باؤ جی ہکلائے، "حضرت بالکل کرتی ہے آپ سنیں تو سہی" نہیں جناب ان کو تو زبان کی الف ب نہیں آتی، ان کی تو تصحیح ہونے والی ہے، حد ہو گئی، آغاز ہی میں یا حسرت، وہ آنکھوں میں حیرت لیے بڑ بڑائے۔ باؤ جی پھر سے گویا ہوئے، "اؤ چلو مٹی پاؤ یا حسرت پہ چل بیٹا تو آگے پڑھ"۔ اب یا حسرت میرے گلے کی پھانس بن کر شکل پر ڈھیروں خفت کی صورت میں نمودار ہو چکا تھا۔ میں نے اگلی لائن ہمت کر کے پڑھ ڈالی۔ لیجیے اعلیٰ حضرت اب اردو زبان کے اصول وضوابط کی دھجیاں اڑتیں مزید برداشت نہ کر سکے اور میری ناشاعری کو بیچ میں شائستگی سے ٹوکتے ہوئے گویا ہوئے" باؤ جی یہ شاعری ہرگز نہیں ہے، کوئی شک نہیں کہ کل کو زبان کے رموز و اوقاف اور اصول وضوابط بچی کوشش کر کے سیکھ لے اور درست شعر کہنے کی صلاحیت پیدا کر لے، لیکن ابھی ان تحریروں کو شاعری نہیں کہا جا سکتا، جدید شاعری بھی قدیم پیمانوں سے ہی ماپی جائے گی۔ بچی کو اس کی پڑھائی پر توجہ دینے دیں میں اس کو کچھ کتابوں کے نام لکھ کر دیتا ہوں" پھر مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے، "بیٹا آپ پڑھائی کے ساتھ ساتھ یہ کتابیں پڑھتی رہیں آپ کو اندازہ ہوگا کہ الفاظ کا چناؤ، وزن، قافیہ ردیف کیسے قائم کیا جاتا ہے" اس کے بعد انہوں نے ایک صفحے پر کچھ لکھ کر دیا گویا میری بدزبانی کا علاج ہو جیسے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم چچا بھتیجی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے واپس آ رہے تھے باؤ جی بالکل یوں چل رہے تھے جیسے آج صبح ہی میں نے ٹی وی پر لگنے والے پانچ منٹ کے دورانیے کے کارٹون پروگرام میں پنک پینتھر کو کسی مشن سے ناکامی پر سر ڈال کے چلتے دیکھا تھا۔ بیچارے سادہ دل باؤ جی، گھر آ کر خیر انہوں نے بڑی شفقت سے کہا، "پتر انہوں نے ہمت ہی نہیں کی نظم پوری سن لینے کی، سن لیتے تو عش عش کر اٹھتے" میں نے کہا، "انکل جی خوش زبان لوگ عش عش نہیں کرتے، کر سکتے ہی نہیں، اگر وہ عش عش ایسے ہی کر ڈالیں تو تصحیح کون کرے گا؟" کہنے لگے، "اچھا دل چھوٹا نہ کر میری بات سن اگلے ہفتے میرا بیٹا آ رہا ہے وہ بہت بڑا شاعر ہے اسلام آباد میں رہتا ہے اس کو ہم تیری شاعری پڑھائیں گے"۔ میری تو نکل جان گئی۔ میں نے کہا، "باؤ جی میری یہ ناشاعری آپ کے لیے حاضر ہے آئندہ ہم ایسا کوئی مذاق نہیں کریں گے۔ قارئین وقت کے پیمانے پر ذرا تیز چل کر آگے آ جائیں، انیس سو اٹھانوے سے 2011 تک بدزبانی اور بے زبانی کے معاملات اور بھی سنجیدہ ہو چکے تھے، الفاظ کے ماخذ اور ان کے استعمال کا سراغ لگائے بنا روزنامچے لکھ لکھ کر، علاوہ ازیں ان کو من مرضی سانچوں میں ڈھال ڈھال ناشاعری اور نانثر سے ہم نے صفحے کالے کر ڈالے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ انگریزی ادب پڑھا۔ سارے اصول وقوانین، اصطلاحات، زبان و بیان کی وارداتیں قصے کہانیاں سب انگریزی میں۔

عجیب سے عجیب تر ہوتا گیا سب کچھ۔ شعور کی منڈیروں پر خیالات کے پرندے اکثر بیٹھتے، لیکن جب جال ڈالتی تو تتر بتر ہو جاتے کیونکہ ہم زبان دانی میں آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر ادبی گونگے ہو چکے تھے۔ خیر 2009 میں لیکچرر ان انگلش کے طور پر ساہیوال کالج میں تقرری ہوئی۔ اب وہاں جو جگر سہیلیاں بنی وہ دونوں اردو والیاں تھی۔ میں 1998 کے واقعہ کو یادداشت کے کسی زندان میں ڈال چکی تھی۔ لیکن لاشعوری طور پر ایک جھجک ہمیشہ کے لیے قائم ہی رہی کہ کسی زبان دان کو اپنی تحریر دکھائی جائے۔ البتہ بہت سے باؤ صاحب جیسے ابھی بھی پڑھ لیتے تو انھی کی طرح دل پہ لے لیتے۔ جب میں نے 2011 میں پھر سے سوچا کہ کیوں نہ اپنے کالج کے اردو ڈیپارٹمنٹ کی کسی پروفیسر کو اپنی لکھی ہوئی حماقتیں چیک کروائی جائیں وہ دن تو ابھی یادداشت میں بالکل تازہ ہے، اور مزید ظلم یہ کہ وہ اپنی ہمزاد یادداشت کو بھی پکڑ دھکڑ لاشعور کے زندان سے نکال لایا۔ سٹاف روم میں اپنی تحریر لیے بیٹھی، میں اچانک دائیں بائیں بیٹھی جگر اردو والیوں کو اطلاع دیے بنا ہی اچک کر ان پروفیسر کے پاس جا بیٹھی اور جھٹ سے اپنا صفحہ ان کے آگے کر ڈالا۔ "میڈم اس کو تصحیح کی نظر سے دیکھیے گا میں تھوڑی رہنمائی چاہتی ہوں" میں نے بڑی شائستگی سے ان کو مخاطب کیا۔ انہوں نے عینک کے پیچھے سے جب صفحہ دیکھ لینے کے بعد مجھے گھورا تو مجھے ذہنی جھٹکا سا لگا جب اچانک وہ اردو کی جانی پہچانی پروفیسر ایک ماضی کے حضرت میں تبدیل ہونے لگیں۔ انھوں نے انتہائی تاسف سے دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے کہا، "ہر بندہ شاعر نہیں ہو سکتا"۔ میں نے ہمت کر کے پوچھا، "میڈم کیا آپ میری رہنمائی کریں گی کہ کیا تصحیح کی جا سکتی ہے؟

"لیکن انہوں نے دائیں بائیں سر ہلانا جاری رکھا میں نے بھی موقع

غنیمت جانا اور اپنی تحریر ان کے ہاتھ سے لے لی اب یہ ایک الگ داستان ہے کہ میری جگر اردو والیوں نے میری شکل سے کیا اندازے لگائے اور کیا تبصرے کیے جبکہ ہم نے کہا، "دیکھا آپ کی پروفیسر یہ پڑھ کر سر ہی دھنتی رہی واہ واہ میں۔ اور میں نے ان کو یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی کہ ہم اپنی تحریروں کے لیے ایک نئی صنف بنانے جا رہے ہیں جو کم از کم شاعری تو ہرگز نہیں ہوگی" جس پر وہ خوب ہنسیں۔ خیر یہ خوش زبان ہر زبان کے پھاٹک پر نہ بیٹھے ہوں تو ہم سے کئی بدزبان، ادبی گونگے آپے سے باہر ہو جائیں۔ پھر اکیسویں صدی کے ٹرینڈز ہر خاص و عام پر اثر انداز ہونے لگے۔ ہر زبان اپنے علاقے سے نکل کر دوسری زبان میں سرایت کرنے لگی۔ دورِ جدیدیت نے مابعد جدیدیت کو گلے لگایا اور اس میں اپنی ہستی فنا کر دیا۔ ہر زبان کا ادب پابندی رسم سے آگے نکل گیا، وہی انسان جو دورِ جدید میں اقدار کھو جانے پر ماتم کرتا تھا، دورِ مابعد جدیدیت میں اس المیہ کو قبول کر کے اسے سر آنکھوں پر بٹھانے لگا۔ انگلش ورلڈ انگلشز کی وسعت میں سمانے لگی۔ ہر بولنے والے نے دعویٰ کیا کہ وہ زبان کو اپنی ضرورت کے مطابق ہی نہیں بلکہ اپنے احساسات و جذبات اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔ تنقید کے زاویے بھی بدلنے لگے۔ سوشل میڈیا نے ہر قسم کی تحریر کو سینے سے لگا یا۔ ہر طرح کے لکھنے والے کو ہر طرح کے پڑھنے والے مل گئے، اور ہر طرح کے بولنے والوں کو ہر طرح کے سننے والے مل گئے۔ نگار خانے میں ایسا شور تو کبھی بر پا ہی نہ ہوا تھا۔ اسی شور کو اب لوگ سمجھنے لگے۔ اسی میں سے اپنی مرضی کا پیغام وصول کرنے لگے یہی ڈس کمیونیکیشن کا جال کمیونیکیشن میں بدلنے لگا۔ بہت سی بے زبانیاں بدزبانیوں میں بدلنے لگی اور زبان دانوں کو یہ برداشت کرنا پڑا کہ نگار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ اور یہ ڈاکٹر حافظ محمد عرفان اور ڈاکٹر رانی آکاش ہاتھ میں ڈنڈا لیے جیسے میرے پیچھے پڑے ہیں کہ یہ تحریریں، بقول ان کے، امانت ہوتی ہیں آپ ان کو ازراہ کرم اب چھپوایا کریں۔ جبکہ مجھے تو بس یوں لگتا ہے کہ یہ تحریریں اکثر میری بے سمت سوچ کے ابال ہی ہوتے ہیں۔ پھر آخر یہ سوچ کر ہمت کی چلو اس نگار خانے میں ایک بدزباں سہی۔

❁❁❁

پروین شاکر

کبھی رُک گئے کبھی چل دیئے
کبھی چلتے چلتے بھٹک گئے

یونہی عمر ساری گزار دی
یونہی زندگی کے ستم سہے

کبھی نیند میں کبھی ہوش میں
تُو جہاں ملا تجھے دیکھ کر

نہ نظر ملی نہ زباں ہلی
یونہی سر جھکا کے گزر گئے

کبھی زلف پر کبھی چشم پر
کبھی تیرے حسیں وجود پر

جو پسند تھے میری کتاب میں
وہ شعر سارے بکھر گئے

مجھے یاد ہے کبھی ایک تھے
مگر آج ہم ہیں جدا جدا

وہ جدا ہوئے تو سنور گئے
ہم جدا ہوئے تو بکھر گئے

کبھی عرش پر کبھی فرش پر
کبھی اُن کے در کبھی در بدر

غمِ عاشقی تیرا شکریہ
ہم کہاں کہاں سے گزر گئے

❁❁❁

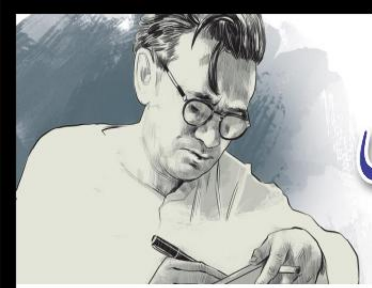

ماتمی جلسہ۔۔ منٹو کی ایک کہانی جو پرانی نہیں ہوگی

تحریر: سعادت حسن منٹو

رات رات میں یہ خبر شہر کے اس کونے تک پھیل گئی کہ اتاترک کمال مرگیا۔ ریڈیو کی تھرتھراتی زبان سے یہ سنسنی پھیلانے والی خبر ایرانی ہوٹلوں میں سٹے بازوں نے سنی جو چائے کی پیالیاں سامنے رکھے آنے والے نمبر کے بارے میں قیاس دوڑا رہے تھے۔ اور وہ سب کچھ بھول کر کمال اتاترک کی بڑائی میں گم ہو گئے۔ ہوٹل میں سفید پتھر والے میز کے پاس بیٹھے ہوئے ایک سٹوری نے اپنے ساتھی سے یہ خبر سن کر لرزاں آواز میں کہا۔ ''مصطفی کمال مرگیا!''

اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی۔ ''کیا کہا مصطفی کمال مر گیا!'' اس کے دونوں میں اتاترک کمال کے متعلق بات چیت شروع ہوگئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ ''افسوس کی بات ہے، اب ہندوستان کا کیا ہوگا؟ میں نے سنا تھا یہ مصطفی کمال، یہاں حملہ کرنے والا ہے...... ہم آزاد ہو جاتے، مسلمان قوم آگے بڑھ جاتی...... افسوس، تقدیر کے ساتھ کسی کی پیش نہیں چلتی۔

دوسرے نے جب یہ بات سنی تو اس روئیں بدن پر چیونٹیوں کے مانند سرکنے لگے اس پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے دل میں جو پہلا خیال آیا یہ تھا۔ ''مجھے کل جمعہ کی نماز شروع کر دینی چاہیے۔'' اس خیال کو بعد میں اس نے مصطفی کمال پاشا کی شاندار مسلمانی اور بڑائی میں تحلیل کر دیا۔

بازار کی ایک تنگ گلی میں دو تین کوکین فروش کھاٹ پر بیٹھے، باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے پان کی پیک بڑی صفائی سے بجلی کے کھمبے پر پھینکی اور کہا میں مانتا ہوں، مصطفی کمال بہت بڑا آدمی تھا لیکن محمد علی بھی کسی سے کم نہیں تھا، یہاں بمبئی میں تین چار ہوٹلوں کا نام اسی پر رکھا گیا ہے۔'' دوسرے نے جو اپنی ننگی پنڈلیوں پر سے ایک کھردرے چاقو سے میل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ ''محمد علی کی موت پر بڑی شاندار ہڑتال ہوئی تھی......'' ''ہاں بھئی تو کل ہڑتال ہو رہی ہے کیا تیسرے نے ایک کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دیا۔ اس نے جواب دیا کیوں نہ ہوگی ارے اتنا بڑا مسلمان مرجائے اور ہڑتال نہ ہو۔'' یہ بات ایک راہ گیر نے سن لی۔ اس نے دوسرے چوک میں اپنے دوستوں سے کہی اور ایک گھنٹے میں ان سب لوگوں کو جو دن کو سونے اور رات کو بازاروں میں جاگتے رہنے کے عادی ہیں معلوم ہو گیا کہ صبح ہڑتال ہو رہی ہے۔ ابو قصائی رات کو دو بجے اپنی کھولی میں آیا۔ اس نے آتے ہی طاق پر سے بہت سی چیزوں کو ادھر ادھر پلٹ کرنے کے بعد ایک پڑیا نکالی اور ایک دیگچی میں پانی بھر کر اس کو اس میں ڈال کر گھولنا شروع کر دیا۔ اس کی بیوی جو دن بھر کی تھکی ماندی ایک کونے میں ٹاٹ، پر سو رہی تھی برتن کی رگڑ سن کر جاگ پڑی۔ اس نے لیٹے لیٹے کہا۔ ''آ گئے ہو؟'' ''ہاں آ گیا ہوں۔'' یہ کہہ کر ابو نے اپنی قمیص اتار کر دیگچی میں ڈال دی اور اسے پانی کے اندر مسلنا شروع کر دیا۔ اس کی بیوی نے پوچھا۔ ''تم یہ کیا کر رہے ہو!'' مصطفی کمال مرگیا ہے۔ کل ہڑتال ہو رہی ہے!'' اس کی بیوی یہ سن کر گھبراہٹ کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کیا مارا ماری ہوگی؟ میں تو ان ہر روز کے فسادوں سے تنگ آ گئی ہوں۔'' وہ سر پکڑ کر رہ گئی۔ میں نے تجھ سے ہزار مرتبہ کہا ہے۔ کہ تو'' ہندوؤں کے اس محلے سے اپنا مکان بدل ڈال پر نہ جانے تو کب سنے گا!'' ابو جواب میں ہنسنے لگا۔ اری پگلی...... یہ ہندو مسلمانوں کا فساد نہیں ہے۔ مصطفی کمال مرگیا ہے...... وہی جو بہت بڑا آدمی تھا۔ کل اس کے سوگ میں ہڑتال ہوگی۔'' ''جانے میری بلا یہ بڑا آدمی کون ہے...... پر یہ تو کیا کر رہا ہے؟'' بیوی نے پوچھا ''سوتا کیوں نہیں ہے!'' ''قمیص کو کالا رنگ دے رہا ہوں ...... صبح ہی ہڑتال کرانے جانا ہے!'' قمیص، یہ کہہ کر اس نے قمیص نچوڑ کر دو کیلوں کے ساتھ لٹکا دی جو دیوار میں گڑی ہوئی تھیں۔'' دوسرے روز صبح کو سیاہ پوش مسلمانوں کی ٹولیاں کالے جھنڈے لئے بازاروں میں چکر لگا رہی تھیں۔ یہ سیاہ پوش مسلمان دوکانداروں کی دوکانیں بند کرا رہے تھے اور یہ نعرہ لگا رہے تھے۔ ''انقلاب زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔''

ایک ہندو نے جو اپنی دوکان کھولنے کے لئے جا رہا تھا۔ یہ نعرے سنے اور

نعرے لگانے والوں کو دیکھا تو چپ چاپ ٹرام میں بیٹھ کر وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے ہندو اور پارسی دوکانداروں نے جب مسلمانوں کے ایک گروہ کو چیختے چلاتے اور نعرے مارتے دیکھا تو انہوں نے جھٹ پٹ دوکانیں بند کر لیں۔

دس پندرہ سیاہ پوش گپیں ہانکتے ایک بازار سے گذر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''دوست ہڑتال ہوئی تو خوب ہے، پر ویسی نہیں ہوئی، جیسی محمد علی کی ٹیم پر ہوئی تھی...... ٹرامیں تو اسی طرح چل رہی ہیں۔'' اس ٹولی میں جو سب سے جوشیلا تھا۔ اور جس کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا، تنگ کر بولا۔ آج بھی نہیں چلیں گی!'' یہ کہہ کر وہ اس ٹرام کی طرف بڑھا جو لکڑی کے ایک شیڈ کے نیچے مسافروں کو اتار رہی تھی۔ ٹولی کے باقی آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا اور ایک لمحہ کے اندر سب کے سب ٹرام کی سرخ گاڑی کے ارد گرد تھے۔ سب مسافر زبردستی اتار دیئے گئے۔'' شام کو ایک وسیع میدان میں ماتمی جلسہ ہوا۔ شہر کے سب ہنگامہ پسند جمع تھے۔ خوانچہ فروش اور پان بیڑی والے چل پھر کر اپنا سودا بیچ رہے تھے۔ جلسہ گاہ کے باہر عارضی دوکانوں کے پاس ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ چاٹ کے چنوں اور ابلے ہوئے آلوؤں کی خوب بکری ہو رہی تھی۔ جلسہ گاہ کے اندر اور باہر بہت بھیڑ تھی۔ کھوئے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس ہجوم میں کئی آدمی ایسے بھی چل پھر رہے تھے۔ جو یہ معلوم کرنے کی کوشش میں تھے کہ اتنے آدمی کیوں جمع ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب گلے میں دوربین لٹکائے ادھر ادھر چکر کاٹ رہے تھے دور سے اتنی بھیڑ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ پہلوانوں کا دنگل ہو رہا ہے۔ وہ ابھی ابھی اپنے گھر سے نئی دوربین لے کر دوڑے دوڑے آ رہے تھے اور اس کا امتحان لینے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے، میدان کے آہنی جنگلے کے پاس دو آدمی کھڑے آپس میں بات چیت کر رہے تھے اور ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''بھئی یہ مصطفی کمال تو واقعی کوئی بہت بڑا آدمی تھا...... میں جو صابن بنانے والا ہوں، اس کا نام ''کمال سوپ'' رکھوں گا...... کیوں کیسا رہے گا؟'' دوسرے نے جواب دیا ''وہ بھی برا نہیں تھا'' جو تم نے پہلے سوچا تھا۔ ''جناح سوپ...... یہ جناح مسلم لیگ کا بہت بڑا لیڈر ہے!''

''نہیں نہیں کمال سوپ اچھا رہے گا...... بھائی مصطفی کمال اس سے بڑا آدمی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''آؤ چلیں جلسہ شروع ہونے والا ہے۔'' وہ دونوں جلسہ گاہ کی طرف چل دیئے۔ جلسہ شروع ہوا۔ آغاز میں نظمیں گائی گئیں۔ جن میں مصطفی کمال کی بڑائی کا ذکر تھا، پھر ایک صاحب تقریر کرنے کے لئے اٹھے، آپ نے کمال اتاترک کی عظمت بڑے بلند بانگ لفظوں میں بیان کرنا، شروع کی۔ حاضرین جلسہ اس تقریر کو خاموشی سے سنتے رہے جب کبھی مقرر کے یہ الفاظ گونجتے۔ ''مصطفی کمال نے درہ※ دانیال سے انگریزوں کو لات مار کر باہر نکال دیا۔'' یا ''کمال نے یونانی، بھیڑوں کو اسلامی خنجر سے ذبح کر ڈالا'' تو اسلام زندہ باد کے نعروں سے کانپ کانپ اٹھتا۔'' یہ نعرے مقرر کی قوت گویائی کو اور تیز کر دیتے اور وہ زیادہ جوش سے اتاترک کمال کی عظیم الشان، شخصیت پر روشنی ڈالنا شروع کر دیتا۔ مقرر کا ایک ایک لفظ حاضرین جلسہ کے دلوں میں ایک جوش و خروش پیدا کر رہا تھا۔ جب تک تاریخ میں گیلی پولی کا واقعہ موجود ہے، برطانیہ کی گردن ٹرکی کے سامنے خم رہے گی۔ صرف ٹرکی ہی ایک ایسا ملک ہے۔ جس نے برطانوی حکومت کا کامیاب مقابلہ کیا اور صرف مصطفی کمال ہی ایسا مسلمان ہے جس نے غازی صلاح الدین ایوبی کی سپاہیانہ عظمت کی یاد تازہ کی، اس نے بہ نوک شمشیر یورپی ممالک سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ ٹرکی کو یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا۔ مگر کمال نے اسے صحت اور قوت بخش کر مرد آہن بنا دیا۔'''' جب یہ الفاظ جلسہ گاہ میں بلند ہوئے تو'' انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد'' کے نعرے پانچ منٹ تک متواتر بلند ہوتے رہے۔'' اس سے مقرر کا جوش اور بڑھ گیا۔ اس نے اپنی آواز کو اور بلند کر کے کہنا شروع کیا۔'' کمال کی عظمت مختصر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنے ملک کے لئے وہ خدمات سرانجام دی ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے کافی وقت چاہئے...... اس نے ٹرکی میں جہالت کا دیوالہ نکال دیا۔ تعلیم عام کر دی تھی نئی روشنی کی شعاعوں کو پھیلایا۔ یہ سب کچھ اس نے تلوار کے زور سے کیا۔ اس نے دین کو جب علم سے علیحدہ کیا تو بہت سے قدامت پسندوں نے اس کی مخالفت کی۔ مگر وہ سر بازار پھانسی پر لٹکا دیئے گئے اس نے جب یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی ترک رومی ٹوپی نہ پہنے تو بہت سے جاہل لوگوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا چاہی۔ مگر یہ آواز ان کے گلے ہی میں دبا دی گئی...... اس نے جب یہ حکم دیا کہ اذان ترکی زبان میں ہو تو بہت سے ملاؤں نے عدول حکمی کی مگر وہ قتل کر دیئے گئے......'''' یہ کفر بکتا ہے'' ...... جلسہ گاہ میں ایک شخص کی آواز بلند ہوئی اور فوراً ہی سب لوگ مضطرب، ہو گئے۔' یہ کافر ہے...... جھوٹ بولتا ہے۔'' کے نعروں میں مقرر کی آواز گم ہو گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا اور وہ چکرا کر اسٹیج پر گر پڑا۔ جلسہ میں بھگدڑ مچ گئی۔

...... اسٹیج پر مقرر کا ایک دوست اس کے ماتھے پر سے خون پونچھ رہا تھا...... اور جلسہ گاہ ان نعروں سے گونج رہی تھی'' ...... مصطفی کمال زندہ باد'' ...... ''مصطفی کمال زندہ باد'' ...... ''مصطفی کمال زندہ باد۔''

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

- Company Incorporation / Registered Office Address
- Personal Income Tax Return investigations
- Rental Income Tax Returns
- UK State Pension Entitlement Review
- Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
- UK State Pension / (Contracted Out) Tracing
- Private UK Pension Tracing
- Assets Review for Inheritance Tax
- Appealing - Past years HMRC Penalties
- Preparation / Filing of prior year tax returns
- Duplicate - Payslips / P60s

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK

CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 **FAX** +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM **WEB** WWW.SARMADGLOBAL.COM